احمد جمال پاشا

بار اوّل

قیمت چار روپے

مطبوعہ تنویر پریس لکھنؤ

پنچ پبلشرز

سردری منزل، کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ

ثروت بھائی

کے نام

جو

خلوص کا امامباڑہ

ہیں

حالاتِ مصنّف

نام ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ احمد جمال پاشا

وطن ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ لکھنؤ

تعلیم ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ایم۔ اے علی گڑھ یونیورسٹی

مشغلہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ تالیف و تصنیف و مدیر اودھ پنچ لکھنؤ

مستقل پتہ ۔۔ ۔۔ ۔۔ ۔۔ اودھ پنچ، لکھنؤ، (یو۔ پی)

مصنّف کی دوسری تصانیف

آئینے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ (خاکے)

مجاز کے لطیفے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔

چند حسینوں کے خطوط ۔۔۔ (پیروڈی) زیرِ طبع

فنِ لطیفہ گوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ تنقید و تاریخ

اودھ پنچ کے لطیفے ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ زیرِ ترتیب

فہرس

چند حسینوں کے خطوط

ڈاکٹر: وزیر آغا

احمد جمال پاشا صاحب کے "ظریف" ہونے میں اب مجھے قطعاً کوئی شبہ نہیں۔ ان کی مزاح نگاری کی صلاحیتوں کا تو میں ایک مدت سے معترف تھا، بلکہ جس روز میں نے "اسکالر" میں ان کی پیروڈی ـــــ "کیوڑا ایک تحقیقی اور تنقیدی مطالعہ" پڑھی تھی تو میں نے اپنے احباب سے صاف لفظوں میں کہہ دیا تھا کہ "یہ صاحبزادے جوان ہوتے نظر نہیں آتے!"۔ پھر جب ان کے دوسرے مضامین دیکھنے کا اتفاق ہوا، یعنی جب وہ خلاف توقع "جوان" ہو گئے تو میں بھی آہستہ آہستہ اپنی "قیافہ شناسی سے منحرف ہونے لگا اور ان کی مزاح نگاری کا معترف ہوتا چلا گیا۔ کچھ عرصہ

ہوں ان کی تصویر ایک ماہنامے میں دیکھی تو یقین نہیں آتا تھا کہ یہ صاحب مزاح نگار بھی ہو سکتے ہیں۔ کیونکہ مزاح نگاری کے لیے راجہ مہدی علی خاں یا مجید لاہوری کی طرح "فربہ اندام" ہونا ضروری ہے۔ اور پاشا صاحب تو کیکر کی طرح سوکھے سڑے نظر آتے تھے۔ بہر حال جہاں ان کے مضامین کے مطالعے میں ان کی مزاح نگاری اور ان کی تصویر دیکھ کر ان کی طنز نگاری کا قائل ہو گیا تھا وہاں مجھے اس بات کا سان گمان بھی نہیں تھا کہ وہ ایک اول درجے کے ظریف بھی ثابت ہوں گے۔ ہوا یہ کہ پاشا صاحب نے "روغنِ قاز" میں بھیگا ہوا ایک خط مجھے ارسال کیا جس میں لکھا تھا کہ میں زیرِ نظر کتاب کا "مقدمہ" لکھ دوں۔ میں دیہات کا رہنے والا ان کی چکنی چپڑی باتوں میں آ گیا اور مقدمہ لکھنے کی حامی بھر لی۔ چند ہفتوں کے بعد اُدھر سے مضامین کا ایک پلندہ موصول ہو گیا۔ اب جو میں لفافہ چاک کر کے مضامین نکالتا ہوں اور ان کا مطالعہ شروع کرتا ہوں تو پہلے ہی مضمون میں مقدمہ لکھنے والوں کی وہ مٹی پلید ہوئی ہے کہ الحفیظ والامان! بس میں تو اسی روز سے ان کے "ظریف" ہونے کا قائل ہو گیا ہوں۔ ان کے ترکش میں ہر طرح کے تیر ہیں۔ جو محض شاعروں، نقادوں، ایڈیٹروں، طالب علموں، سیاست دانوں اور دکان داروں کے لیے ہی مخصوص نہیں، بلکہ جن کی زد سے ان کی اپنی کتاب کا "مقدمہ نگار" بھی محفوظ نہیں رہ سکا۔ میں تو خیر اب گرفتار ہو ہی چکا ہوں، پاشا صاحب کے آنے والے مجموعوں کے ہونے والے مقدمہ نگاروں کو مطلع کرتا ہوں کہ یہ مصنف بہت "خطرناک" ہو اور اس کی معیت میں سفر کرنے والا کوئی شخص بھی محفوظ نہیں چاہے وہ اس کی تصنیف کا مقدمہ نگار ہی کیوں نہ ہو۔

لیکن اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ احمد جمال پاشا صاحب کے ہاں طنز کی فراوانی
ہے۔ بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ان کے ہاں طنز کم اور مزاح زیادہ ہے۔ اور جہاں کہیں طنز
ہے ان کے ہمدردانہ اندازِ نظر، ان کی شگفتگی اور ظرافت میں لپٹی ہوئی ہے، چنانچہ ان کا
سارا ردعمل ایک ایسے شخص کا ردعمل ہے جو مسرت اور شادمانی مٹھیاں بھر بھر کے
لٹاتا ہے اور جسے زندگی کی تمام تر ناہمواریاں بے حد عزیز ہیں۔ اسی لیے ان کا اصل
منصب ایک مزاح نگار کا ہے۔ طنز برہمی کا نتیجہ ہے۔ اس کے خالق کی حیثیت ایک
ایسے روٹھے ہوئے انسان کی سی ہے جو زندگی کی ناہمواریوں سے نفرت کرتا اور انہیں
تبدیل کر دینے کا خواہاں ہوتا ہے۔ وہ بنیادی طور پر ایک تخیل پرست انسان ہوتا ہے۔
اور چونکہ "حالی" اس کی توقعات کے مطابق نہیں ہوتا اس لیے وہ اس کی بے اعتدالیوں کو
نشانۂ طنز بناتا ہے۔ اس کے برعکس مزاح نگار کی حیثیت ایک صحت مند انسان کی سی ہے جو
ہر شے کو پیار کرتا اور اسے بھینچ کر اپنے سینے سے چمٹا لینا چاہتا ہے۔ پاشا صاحب
اس لحاظ سے مزاح نگار ہیں کہ ان کے ہاں ہمدردانہ اندازِ نظر موجود ہے۔ اور وہ نفرت
موجود نہیں جو طنز نگار کے ہاں بہت نمایاں ہوتی ہے۔ لیکن ساتھ ہی ساتھ وہ طنز
کے استعمال سے شرماتے بھی نہیں جانتے۔ بس یوں سمجھئے کہ وہ مخاطب کی چٹکی
لیتے ہیں اور جب وہ "سی" کر کے ان کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو بڑے پیار سے اُن کے
شانوں پر ہاتھ رکھ کر ہنسنے لگتے ہیں اور وہ بھی خفیف سا ہو کر ان کی ہنسی میں شریک
ہو جاتا ہے۔ پاشا صاحب کا عام طریق یہی ہے، اور اسی لیے ان کا مخاطب کسی
ردعمل کا مظاہرہ نہیں کرتا۔ بلکہ چپکے سے، ذرا سا ہنس کر، ذرا سا پہلو بدل کر، ان
کی بات مان لیتا ہے۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو راقم الحروف مقدمہ لکھنے والوں پر ان کا

مضمون پڑھ کر مقدمہ لکھنے کے بجائے اب تک کسی اور معقول ردعمل کا مظاہرہ کر چکا ہوتا۔ جیسے مثلاً پاشا صاحب پر مقدمہ، یا خودکشی وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر راقم الحروف نے کسی ردعمل کا مظاہرہ نہیں کیا اور چپکے سے مقدمہ لکھنے پر آمادہ ہو گیا ہے تو یہ سب پاشا صاحب کے مخصوص طریق کار کا نتیجہ ہے ـــــ طریق کار جس میں نفرت کے بجائے محبت اور برہمی کے بجائے خلوص اور اغماض و درگذر کی فراوانی ہے۔

یوں تو شاید احمد جمال پاشا کے ان مضامین کو پڑھ لینے کے بعد کوئی ایسی سا بھاری بھرکم "مقدمہ" لکھنے کی تحریک بھی نہیں ہوتی۔ وجہ اس کی غالباً یہ ہے کہ پاشا صاحب کے مضامین ان کے خلوص کی پیداوار ہیں اور ریاکاری ان میں نام کو بھی نہیں۔ پھر مقدمہ لکھنے والا کس طرح اس کا مرتکب ہو سکتا ہے۔؟۔ اگر یہ بات نہ ہوتی تو راقم الحروف اتفاقاً بھی اس "مقدمہ" کا آغاز "ہنسی" کے بارے میں ان مختلف نظریات سے کرتا جو ارسطو سے لے کر ہابز، ہینزمٹ، ڈارون، کانٹ، سُلی، برگسان، فرائڈ، گریگ، ایسٹ مین، اور آرتھر کوسلر تک پھیلتے چلے گئے ہیں اور پھر شاید قاری اور مصنف دو ـــــ دونوں کو مرعوب کرنے کے لیے مزاح اور اس کے امائل ـــــ طنز، تحریف، وٹ، رمز، تلخ اندیشی، کا میدان اور فارس کے فرق کو تفصیل سے بیان کرتا۔ وہ اسی پر اکتفا نہ کرتا، بلکہ مزاح کے تدریجی ارتقا کو واضح کرنے کے لیے شیخ سعدی سے لے کر شیخ چلی تک اور مصطفیٰ کمال پاشا سے لے کر احمد جمال پاشا تک ـــــ سب بھلے آدمیوں کو لا کر ایک ہی صف میں لا کھڑا کرتا اور پاشا صاحب کے مزاح کو، مزاح کی روایت کے ساتھ اور مزاح کی روایت کو پاشا صاحب کے مزاح کے ساتھ منسلک اور مربوط کر کے دنیا و عقبیٰ دونوں میں

سرخروئی حاصل کرنے کی سعی کرتا۔ لیکن چونکہ اس کی نیت نیک ہے اس لیے آپ دیکھئے کہ اس نے محض اپنے تاثرات کے اظہار تک ہی اپنے مساعی کو محدود رکھا ہے۔ اور اس خاص میدان سے ایک قدم باہر نکلنے کی کوشش نہیں کی۔

وزیر آغا

یکم نومبر ۶۵ء

مقدّمے کا مقدّمہ

گھبرائیے مت! میں آپ پر مقدمہ چلانے نہیں جارہا ہوں، بلکہ مقدمے کے بارے میں کچھ تبلانے ہی پر اکتفا کروں گا۔

مقدمہ پہلے ایجاد ہوا یا لڑائی، مگر اتنا ضرور کہوں گا کہ لڑائی بلا مقدمے کے ادھوری رہ جاتی ہے اور مقدمہ بغیر لڑائی کے بے کیف۔ غرض مقدمہ ہو یا لڑائی جب تک فریقین کو ایسے حضرات نہ مل جائیں جو ہنگامہ میں دلچسپی کا اظہار کرسکیں اور خدائی فوجدار کی خدمات بھی انجام دے سکیں اور لڑنے والوں کی حماقت کو حق بجانب بھی تسلیم کرسکیں تب تک اس مقدمہ بازی میں رنگ پیدا نہیں ہوتا۔ اور وہ رنگ کیا جس میں بھنگ نہ ہو۔ القصہ مختصر جب تک اس رنگا رنگ کے پروگرام میں کچھ دل بڑھانے والے اور کچھ تماشائی نہ ہوں بات ادھوری رہ جاتی ہے۔ غالباً اس وجہ سے یہ خیال بے جا نہ ہوگا کہ دنیا کا سب سے پہلا مقدمہ جس نے لڑا ہوگا یقیناً وہ کوئی

بہت بڑا جانور رہا ہوگا۔ اور اسی جانور کی روح آج بھی ہر مقدمہ باز کے قالب میں حلول کیے ہوئے نظر آتی ہے اور اس میں جب بھی کوئی کمی واقع ہو جاتی ہے تو دائر کیا ہوا مقدمہ آپ کے دائرہ سے خارج ہونے لگتا ہے۔

اس مقدمہ بازی کو اگر صرف کچہری عدالت تک محدود کر دیا جائے تو یقیناً خود مقدمہ پر بڑا ظلم ہوگا۔ خود آپ کا ہر قسم کے مقدموں اور مقدمہ بازوں سے سابقہ پڑتا ہوگا۔ جیسے وہ مقدمات جو گھر میں آئے دن خود آپ کو فیصل کرنا پڑتے ہوں گے۔ اور اس وقت بھی آپ میں سے بہت سے حضرات ان سے ذاتی طور پر دو چار ہو رہے ہوں گے جن کے لیے یہ خاکسار ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔ ہاں تو میں یہ کہنے والا تھا کہ اس قسم کے مقدمے جو خفیفہ کی گھریلو عدالت میں سنے اور لڑے جاتے ہیں عموماً بچوں سے متعلق ہوتے ہیں اور کھیل ہی کھیل میں نپٹا دیے جاتے ہیں۔ مگر خصوصاً بڑوں ہی سے متعلق ہوا کرتے ہیں۔ جن کو مونٹی سوری سسٹم سے تو نہیں نپٹایا جا سکتا مگر تعلیم بالغان سے ضرور فائدہ اٹھایا جا سکتا ہے۔

پھر بھی اچھی خاصی تعداد ایسے مقدمات کی رہ جاتی ہے جن میں "من و تو" کو دست و گریبان ہونے کا موقع نہیں مل پاتا، کیونکہ ان کی سادی کارروائی کاغذی ہوتی ہے اور وہ بھی یک طرفہ چنانچہ اس کاغذی پیرہن کے نہ اوڑھنے کی نوبت آتی ہے نہ بچھانے کی نہ اس میں مقدمہ دائر کرنے، موکل بننے، وکیل بنانے، اور پیروی کرنے کے لیے پاپڑ بیلنے کی ضرورت لاحق ہوتی ہے اور نہ اپیل کی گنجائش ہوتی ہے۔

یہ مقدمہ کی سب سے انوکھی قسم تو آپ کو ضرور معلوم ہوگی۔ مگر ساتھ ہی بیحد

عام بھی۔ اس عام اور گھاس کا جلوہ آپ کو صرف کتابوں ہی میں ملے گا میرا
مطلب قانون کی کتابوں سے نہیں ہے۔ مگر میں ان کو بھی اس سے مستثنیٰ نہیں کر سکتا
اس راز سے شاید آپ بھی واقف ہوں کہ دنیا کے اہم اور عجوبہ راز کاغذ کے
سینے پر نقش کر کے قید کر دیے گئے ہیں۔ یہ بالکل الگ بات ہے کہ کسی مسخرے
نے اس راز کو موم جامہ پہنا کر اپنے مرید کے بازو پر باندھ دیا۔ اور کسی نے مثل
سقراط اور بقراط ہی نوع انسان پر عالم آشکارا کر دیا۔ مگر کچھ لوگ ایسے بھی تھے
جنھوں نے اپنے افکار و خیالات کو نہ قید کیا نہ آزاد بلکہ ایک معمہ یا چیستان بنا کر
اس کو پبلک کے حال پر چھوڑ دیا۔ ہمارے شعر و ادب کا خاصہ نا معقول حصہ بھی آپ کو
اسی چھپانیت یا "چیستان ازم" کا شکار ملے گا۔ مگر چیستان زنی کی واردات اور مقدمات
کی بھرمار کی پرچھائیاں ہمارے شعر و ادب پر آپ کو اول تا آخر نظر آئیں گی اور عجیب
ڈھنگ در روپ میں ملیں گی۔ کہیں جناب کتاب تو شکل سے چھٹانک بھر کی ہے اور
مقدمہ اس پر لکھا گیا پنسیری بھر کا، کہیں صرف مقدمہ ہی ملا اور کتاب کے سلسلے
میں محض اشاروں سے کام لیا گیا۔ یا مقدمہ حاضر ہے اور کتاب کا کہیں دور
دور تک پتہ نہیں، چنانچہ لوگ مقدمے ہی سے کام چلا لیتے ہیں۔ اکثر ایسا بھی ہوا
کہ ایک ہی کتاب پر مقدمہ بازوں کے ایک پورے گروہ نے حملہ کر دیا۔ اور ان
مقدمات کے بیچ میں کتاب ایسی دبی کہ پھر کبھی نہ ابھر سکی اور یوں بھی گذری کہ
کتاب نے اتنی جگہ گھیر لی کہ مقدمہ باز بے چارہ قلم ہی تولتا رہ گیا اور کتاب اپنے
کو صاف بچا لے گئی۔ چنانچہ اس کا توڑ یہ دریافت کیا گیا کہ اگر کتاب نے پوری جگہ
گھیر لی تو کوئی غم نہیں، ہم بھی ایک کونے میں پڑے رہیں گے اور اسی بہانے

برورق سے چپٹے رہنے اور چھٹکارا نہ چھوٹے۔ گو اس میں کبھی سختیاں ہوئیں اور مصنف نے سرورق کی کچھ جگہ تصویر کے بہانے گھیرنا شروع کردی۔ غرض مقدمہ بازوں نے طویل مقدمے لکھے، قصیدے لکھے، مبارک سلامت کا شور مچایا، اگر کچھ بس نہیں چل سکا تو کم از کم مصنف کی تاریخ وفات ہی کا اس میں اپنی طرف سے اضافہ کروادیا۔ کسی نے اس بہانے کہ مقدمہ کتاب کا دیباچہ ہو کچھ نہ کچھ لکھ مارا۔ کسی نے مقدمے کو کتاب کا عنوان قرار دیا۔ مقدمہ بازوں سے نجات حاصل کرنے کے لیے مصنفوں نے خود ہی اپنی کتابوں پر مقدمے چلانے شروع کردیے۔ کڑی شرط بھی لگاتے چلے گئے، اگر صرف تعریف لکھنا ہو تو لکھو ورنہ ہم لکھ لیں گے۔ جب مقدمہ بازوں نے کوئی راہ مقدمہ نہ پائی اور راہِ فرار اختیار کرنے پر راضی نہ ہوئے تو اکثر تو اس قدر خفا ہوئے کہ انھوں نے بجائے اصل کے صرف نقل پر اکتفا کی اور فلسفۂ قناعت کا سہارا لے کر بلا کسی مسودے کا سہارا لیے صرف مقدمے لکھنا شروع کیے اور علمِ بغاوت بلند کیا اور کچھ انڈر گراؤنڈ ہو گئے اور چھپی ہوئی کتابوں پر چھاپے مارنے لگے اور تبصرہ کے بہانے ان اخبارات اور رسائل کا سہارا لے کر مقدمے چلانا شروع کیے۔

یوں تو بہت سے مقدمے چلائے گئے۔ مگر سب سے مشہور مقدمہ مولانا حالی نے اردو شاعری پر چلایا تھا جس نے بڑی شہرت حاصل کی۔ بہت سے لوگوں نے اس ادا کو پسند کیا اور ادب کی مختلف روایتوں کی آڑ لے کر ان پر مقدمے چلانا شروع کیے۔

مگر مقدمہ بازوں کا ایک گروہ ایسا بھی رہ گیا جس کی یاد اتنی پوچھ گچھ

نہ تھی کہ ان سے کوئی مقدمہ لکھواتا یا ان کی مقدمہ بازی کو خاطر میں لاتا، یا پھر وہ لوگ تھے جو باقاعدہ مقدمہ بازی بھی کرتے اور شب خون مارنے والے ان چھاپہ ماروں کے گروہ میں شامل ہو گئے اور لکھی لکھائی اور چھپی چھپائی کتابوں اور مقدموں کی اپیل کرتے۔ یہ گروہ شستری اور ساخت کے اعتبار سے کچہری کے منشیوں سے ملتے جلتے تھے اور انھوں نے کتابوں پر حواشی لکھنے میں اپنا نام پیدا کیا۔ ان لوگوں نے لکھی ہوئی کتابوں پر مزید مقدمے کیوں لکھے۔ اس کی تاویل وہ بطور عذر جو پیش کرتے ہیں وہ بھی نہایت دلچسپ اور قابل سماعت ہے۔ کچھ کا کہنا ہے کہ اگر یہ کتاب یوں ہی چھوڑ دی جاتی تو اس کے ارتقار کی کڑی ٹوٹ جاتی اس لیے ہم اس میں وقتاً فوقتاً مزید اضافے کرتے رہے، کسی نے اس وجہ سے مزید مقدمہ لکھا کہ اس سے قبل جو مقدمہ لکھا گیا تھا وہ قطعی ناکافی تھا۔ اور برخلاف اس کے کسی نے احتجاجاً مقدمہ لکھا کہ پہلے جو کچھ لکھا گیا تھا وہ بہت زیادہ تھا اور اس طرح انھوں نے طویل مقدمہ کو اپنے قلم کی جنبش سے طویل ترین بنا دیا۔ کسی کو مقدمہ کا اصل مقدمہ پسند نہ آیا تو اس نے اس پر اصلاح اور نظر ثانی پر اکتفا کیا۔ اور کچھ نے سرے سے مقدمہ چلا کر میدان جنگ کا نقشہ ہی پلٹ دیا۔ اور بعض مقدمے تو پوری کتاب پر امر بیل کی طرح چھا گئے۔ اکثر یہ عذر بھی پیش کیا گیا کہ لائبریریوں میں بجائے کتاب کے چپراسی مل جاتا ہے جو دروازے ہی پر سے جھنڈی دکھلا دیتا ہے۔ لیکن اگر کبھی کبھار کوئی مفید کتاب اس کے توسط سے مل جاتی ہے تو یہ ہمارا فرض ہوتا ہے کہ ہم اس کو مفید ترین کتاب میں تبدیل کر دیں، اور جہاں پر مزید مقدمہ چلائے بغیر ممکن نہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اس کے بعد یہ کتاب عام آدمی کے لیے جو علم غیب وغیرہ سے ناواقف رکھا گیا ہو، قطعی بیکار

ہو جاتی ہے۔ گر عام لوگ یوں بھی کب مفید کتابوں سے فائدہ اٹھا پاتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ اگر کتاب کسی کی ذاتی ہو تو اول تو وہ خود کیوں نہ مقدمہ چلائے۔ دوسرے اگر آپ پرائی کتاب پر مقدمہ چلانے کی جرأت بھی کریں خواہ اس وقت آپ کی نیت محض کتاب کا پوسٹ مارٹم کرنا ہو تب بھی وہ آپ کو کیوں بخشنے لگا۔ اول تو اس میں ایسی صورت بھی پیدا ہو جانے کا احتمال رہتا ہے جس کے آخر میں لوگوں کو اس کی عیادت کرنے ہسپتال جانا پڑتا ہے۔ اور اگر صورت حال زیادہ خراب ہو جائے تو وہ آپ کے مقدمہ کی اپیل عدالت میں بھی کر سکتا ہے۔ اور اس نکتہ سے تو مقدمہ باز حضرات بھی بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ سر سے موج خون گزر جاتی ہے "قطرہ کے گہرے ہونے تک" اس لیے ہمیشہ مقدمہ باز حضرات کو ایسی کتابوں کی اشد ضرورت رہتی ہے جو مشترکہ ملکیت ہوں جس کے لیے لائبریریوں ہی کا سہارا لینا پڑتا ہے اور وہیں ہم کو اس قسم کے نکتے بھی ملتے ہیں، یہ مقدمہ باز اکثر بطور تاوان کتاب میں سے پہلے تصویریں اور نقشے پار کر دیتے ہیں —— کیونکہ یہ مقدمہ باز ہوتے ہیں مگر آرٹسٹ ہونے سے پرہیز کرتے ہیں اور بعض اس خیال کے تحت بھی غائب کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو اس کا احساس رہے کہ یہ کتاب بیکار نہیں ہے اس کو پڑھنے والے معمولی لوگ نہیں بلکہ اہل ذوق تھے جو بطور ثبوت کتاب کے صفحات اس طرح لے گئے گویا ہم نے کتاب پڑھی —— ہم نے اس پر مقدمے چلائے اور اب ہم اس کے ورق لیے جا رہے ہیں مثل رسید تاکہ سند رہے اور "وقت ضرورت کام آئے" خواہ پھر کسی کے بھی کام نہ آئے۔

فاضل مقدمہ نگار ان کتابوں کو لے جا کر ان کی کتابت کرتے ہیں، اور

ادارت کے فرائض انجام دیتے ہیں۔ اصلاح کے اُستادانہ ہاتھ دکھاتے ہیں غرض جو کچھ بھی ہوتا —— ہوتا دلچسپ ہے۔ ادبی اور تنقیدی کتب کے مقدمات میں میر و سودا سے لے کر میاں بی بی کے جھگڑے غم جاناں، غم دوراں، غم یاراں، تھیٹر اور بائیسکوپ کی باتیں وغیرہ تو جو کچھ ہو بلے خوب ہوتا ہے اور اپنے اندر اپیل کرنے کی پوری گنجائش رکھتا ہے، مگر اس سے بھی دلچسپ وہ ہوتا ہے کہ ان مقدموں پر مقدمہ چلانے کے بہانے اللہ سے نہایت ہی کلاسیکل قسم کے گھریلو جھگڑے سمیٹ لئے جاتے ہیں جن کے لیے شعراء حضرات کے دامن کا سہارا لے کر کبھی دیوانگی کا اظہار کیا جاتا ہے اور کبھی بیگانگی۔ غرض یہ مقدمے اس وقت تک چلتے رہتے ہیں جب تک کہ کتاب بازار میں مقبول ہونے کے لیے بنیے کی دکان تک نہ پہونچ جائے جہاں پھر اس کی مفت کی پڑیاں انھوں ہاتھ تقسیم کی جاتی ہیں۔ یا حلوائی اس کے ذریعہ شیرینی تقسیم کرنے کی سعادت حاصل کرتا ہے، یا پھر دیمک ان کا صفایا نہ کر دے۔

ان کتابوں میں جو مقدمات پیہم کی بھرمار ہوتی ہے اور پنچایتی خفیفہ کی عدالتوں سے لے کر عدالتِ عالیہ تک کے شطرنجی مہروں کی بساطیں بچھائی اور اُلٹی جاتی ہیں اُن کی ایک آدھ جھلک کیوں نہ آپ بھی دیکھیں، گو کہ میرے پاس وقت محدود ہے جو ان کی وسعتوں کو اپنے دامن میں سمیٹنے سے فی الحال قطعی معذور رہے مگر پھر بھی حاضر میں حجت کیسے کر سکتا ہوں۔

بطورِ تبرک ارشاد ہے کہ ایک صاحب نے لکھا کہ "آپ لوگ کتاب پہ اپنا نام لکھ کر کتاب کا ستیاناس مار دیتے ہیں۔" اسی کے نیچے کسی صاحب نے جن سے نہ رہا گیا لکھتے ہیں۔ "آپ بھی بالکل وہ ہیں، آپ کتاب پہ لکھنے کو منع کر سکتے تھے

گر آپ نے اپنا نام کیوں لکھ دیا؟" اور اس کے نیچے انھوں نے نہ صرف اپنا نام لکھا بلکہ اس کے نیچے تاریخ و سنہ لکھا، اپنا پورا پتہ لکھا، غرض کہ لطف یہ کہ کتاب پر نہ لکھنا چاہیے کی ساری بحث کتاب پر لکھ کر کی گئی۔۔ کسی کتاب میں مصنف نے کافی مفید اور کام کی باتیں جہاں بتلائی تھیں اور اہم انکشافات کیے تھے اس کو انڈر لائن کر کے کسی صاحب نے لکھا کہ "سوسائٹی آپ کی اس مفید ریسرچ کا شکریہ ادا کرتی ہے"۔ اس کے نیچے جو کچھ درج تھا اس میں پوچھا گیا تھا کہ "کیا آپ سوسائٹی ہیں؟"۔ کسی صاحب نے لکھا کہ "ہر کھاگھ عاشق کا امتیاز خصوصی یہ ہو کہ وہ بدصورت ہو۔" فوراً اس کے آگے کسی مسخرے نے لکھ دیا (" جیسے آپ ") ـــــ کسی مصنف کو لکھنے کے لیے کسی شعر کا سہارا لینے کی ضرورت پڑی، چنانچہ اس بیچارے نے یہ مصرع حسب حال پاکر لکھ دیا۔" وہ گلیاں یاد آتی ہیں جوانی جن میں کھوئی ہے"۔۔ اس کے نیچے فوراً لکھ دیا گیا ـــــ " ہمیں آپ سے ہمدردی ہے"۔ ایک کتاب پر مصنف کا فوٹو چھاپا چھاپا گیا تھا اس کے نیچے پبلشر کی طرف سے اس قسم کی کتابوں کے شائع کرنے کا ایک پروگرام بھی درج تھا ـــــ اس کے نیچے کسی نے لکھ کر دریافت کیا تھا، کیا کارٹونوں کے شائع کرنے کا یہ سلسلہ اب مستقل چلے گا ـــــ ؟"۔ ایک شاعر کے دیوان کے صفحۂ اول پر لکھا ہوا تھا۔ "پہلے اس کو پڑھیے ورنہ پچھتایئے گا ـــــ پھر مطلع کچھ یوں تھا۔ "اگر آپ کے پاس فالتو وقت ہے تب بھی خدا کی قسم اس کو نہ پڑھیے۔ ورنہ میرے عزیز آپ کا وقت برباد ہوگا اور روح ناشاد ہوگی۔" اس کے نیچے کسی نے مقطع عرض کیا تھا۔ "بھیا کیوں شاعری کے پیچھے پڑے ہو ـــــ اس میں کیا رکھا ہے، کوئی کام کی بات کرو ـــــ"

مگر اس کام کی بات یہ مجھے یاد آ گیا کہ نہ کام کی بات کتاب کے اندر ملتی ہے نہ باہر، شکل ہی سے کتاب سازی اور مقدمہ بازی کے سوا کچھ ہاتھ آتا ہے۔ مگر جو کچھ میرے ہاتھ آچکا ہے وہ میں نے محفوظ کر لیا ہے۔ اور اس پر عنقریب میرا ارادہ خود ایک مقدمہ لکھنے کا ہے، بہت ممکن ہے کہ وہ مقدمہ ان ہی مقدمات پر ہو۔ اور ابھی ابھی جو کچھ آپ پڑھ رہے تھے وہ بھی ایک مقدمہ ہی تھا۔

• ہمارے پاس ادبی تنقید کا کوئی جمہوری طریقہ نہیں۔ فی زمانہ ادب میں خواجہ سرائیاں عام ہیں۔ سرقہ، توارد اور آورد سے شعراء نے ادب کا ناک میں دم کر رکھا ہے موجودہ ادیب ادب کے نام پر ٹریش لکھ رہے ہیں۔ ادب اس وقت پیسے کمانے، نعرے بازی، گروپ بندی اور پگڑی اچھالنے کا اکھاڑہ بنا ہوا ہے، ادب کی محترم ہستیاں بے ادبی تک کرنے سے نہیں چوک رہی ہیں۔ ہم کو اقتدار اپنے ہاتھ میں لے کر ادب کی رفتار سنبھالنا ہے، ہم اس وقت تک چین سے نہ بیٹھیں گے جب تک کہ موجودہ ادب کو دنیا کے صالح ترین ادب کے مقابلہ میں نہ کھڑا کر دیں۔"

اعلانات کے مطابق دھمکی دے دی گئی تھی کہ اگر کسی ادیب یا پبلشر نے دوکان بند کی تو اس کے خلاف فوجی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے گا۔ کاروبار ادب کو حسب معمول چلانے پر زور دیا گیا۔

اس فوجی انقلاب کے روح رواں بریگیڈیر گلدار، لیفٹیننٹ کرنل غیض، کرنل مشفق الرحمن، کیپٹن صغیر جعفری، ملک ادب کے ممتاز ترین جاسوس کرنل آفریدی اور کیپٹن وحید کی خدمات بھی حاصل کر لی گئیں تھیں۔ سارا پلان نہایت احتیاط سے تیار کیا گیا تھا، رات کے بارہ بجے انقلاب عمل میں آگیا، ادبی مراکز اور صدر کی رہائش گاہ فوج کی حفاظت میں تھے۔ بڑے بڑے شاعر، ادیب اور نقاد اپنے اپنے گھروں میں نظربند کر دیئے گئے تھے۔

ابھی تک کسی شورش کی خبر نہیں آئی، پورے ملک ادب میں مکمل امن و امان تھا۔

ادب میں انقلاب کے اسباب وہ حالات تھے جو اور زیادہ نہیں خراب

ہو سکتے تھے۔ بلکہ اسی خرابی سے خون خرابے کے کام لیے جا رہے تھے۔ گو کہ طوائفوں نے لکھنؤ اسکول کے بعد سے ایک حد تک اردو ادب کا ساتھ چھوڑ دیا تھا۔ مگر پھر بھی موجودہ دور مکمل طور پر طوائف الملوکی میں مبتلا تھا، سارا ادب ایک گمنام دیوان کے نامکمل مقدمہ کے گرد بلا کسی "تھیوری" کے گھوم رہا تھا، الٹی سیدھی تعبیریں پیش کرنے والے ناقد جو انگریزی کے شوق میں اردو اور اردو کے زعم میں انگریزی سے نابلد تھے عموماً ایک ہی مضمون میں ایک سے زیادہ رائے کا استعمال کر ڈالتے تھے ناقدین کی بستیاں اپنی برادری تک محدود رہتیں اور برادری کے باہر جانے والے کا حقہ پانی بند کر دیتیں، شخصی تاثرات کے عمل اور ردعمل نے ادب کو گورکھ دھندا بنا دیا تھا۔ امراء، حکام، رشتہ دار، احباب، اور خدمت گذار ہی تعریف کے دائرے میں آتے تھے، ادب کے ذمہ دار وہ لوگ نہیں تھے جو تاج محل بنانا جانتے ہوں، بلکہ تاج محل کھودنے کے فن سے واقف ہوں، عموماً جس کے بارے میں کسی کونے سے کوئی فتویٰ صادر کر دیا جاتا تھا، بقیہ سب اسی کو اپنے الفاظ میں ہرا دیتے، ادبی سرقے، سرقہ بالجبر کی صورت اختیار کر چکے تھے۔ ادب، صحافت اور حماقت کے درمیان خطِ فاصل کھینچنا مشکل تھا۔ نئے نام لیتے ہوئے سب بے حد ڈرتے اور گھبراتے تھے۔ اچھا ادیب وہ سمجھا جانے لگا تھا جو زیادہ بکے، زیادہ تر ادیب سرِ شام ہی سے کرداروں کی تلاش میں آبادی سے دور نکل جاتے، جہاں وہ سنسنی خیز ڈاکو، جنگلی درندے، بدروحیں، بھوت، پریت، ٹارزن اور کنگ کانگ جیسے عجوبے اٹھا لاتے، تقریباً بیشتر ادب اسی قسم کے داغ دھبوں سے چیچک زدہ ہو رہا تھا جس کی صفائی اب فوج کی نگرانی میں ہو رہی ہے۔

نقادوں کی مسلسل کوششوں کے نتیجے میں لوگوں نے قدیم اور جدید ادب کے مطالعے کے بجائے تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ اصل کتاب پڑھنے کا فیشن اب تقریباً آؤٹ آف ڈیٹ ہو چکا تھا۔ نقادوں کے مسلسل اصرار پر بہت سے اچھے افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں نے افسانے اور ناول لکھنے سے توبہ کر لی تھی، لوگوں نے بھی بہترین ناول و افسانے پڑھنے کے بجائے بدترین تنقیدیں پڑھنا شروع کر دی تھیں۔ مگر خود تنقید میں پتہ لگانا مشکل تھا کہ کس کا کون سا رنگ ہے۔ یا موجودہ رنگ کہاں سے اُڑایا گیا ہے۔ اگر مقالہ نگاروں کے نام اُڑا دیے جائیں تو وہ سب کسی ایک ہی نوشق طالب علم کی تحریریں معلوم ہوں، ایک ہی بات کو بار بار لکھنے کا مرض عام ہو گیا تھا۔ اس اُستادانہ پینترے بازی میں ایک ممتاز نقاد نے تو کمال ہی کر دیا۔ ان حضرات نے کسی زمانے میں مومن پر ایک مقالہ لکھا جس کی بڑی واہ واہ ہوئی۔ کچھ عرصے بعد انھوں نے اسی مقالے کو پھر نئے عنوان سے شائع کروا دیا۔ اور پھر واہ واہ مچ گئی فوجی حکام نے جب ان کے گھر پر چھاپہ مارا تو ان کی کل کائنات ادب یعنی "مومن" پر مقالہ برآمد کر لیا گیا۔ فوجی حکومت کے ایک اعلانیے کے مطابق پہلے اس مقالے کا عنوان صرف "حکیم مومن خاں مومن" تھا جس کو انھوں نے حسب ذیل عنوانات سے متعدد بار چھپوایا جو ذیل کی فہرست سے بخوبی واضح ہو سکتا ہے:۔

"حکیم مومن خاں مومن" ——— "مومن خاں مومن" ——— "مومن کی شاعری" ——— "مومن کی غزل گوئی" ——— "مومن شاعری کے آئینے میں" ——— "مومن بحیثیت شاعر" ——— "مومن اور اُن کی شاعری" ——— "مومن کی شاعری کا نفسیاتی تجزیہ" ——— "مومن ایک مطالعہ" ———

_____ "مومن میری نظر میں" _____ "مومن ہماری نظر میں" _____ "مومن اردو شاعری کی نظر میں" _____ "اردو شاعری کی نظر مومن پر" _____ "مومن ایک مطالعہ" _____ "مومن کی شخصیت اور شاعری" _____ "مومن اور تصوف" _____ "مومن کا محبوب" _____ "مومن کا لب ولہجہ" _____ "مومن اور ہم" _____ "مومن اور میں" _____ "مومن _____ ایک سوال" _____ "کیا مومن شاعر تھے؟" _____

قبلہ کا ارادہ اب اس پر مقدمہ لکھوا کر مجموعہ شائع کر دینے کا بھی تھا۔ مگر فوج نے اس پر قبضہ کر لیا ہے۔ ان کو فریب دہی کے الزام میں جیل بھیج دیا گیا ہے اور وارننگ دے دی گئی ہے کہ آئندہ وہ کبھی مومن پر کچھ نہ لکھیں۔ خیال ہو کہ جیل میں ان کو سزا کے طور پر مومن کا باقاعدہ مطالعہ کرنے کی قید بامشقت دی جائے گی۔ ایک دوسرے بزرگوار جن کا کورٹ مارشل کرنل آفریدی کی عدالت میں کیا گیا۔ کیپٹن وحید کی اطلاعات کے مطابق وہ بہت سے تنقیدی مقالات اور کتب سامنے رکھ کر "غالب" کے اوپر ایک مقالہ منتقل کرتے ہوئے پکڑ لیے گئے۔ ان پر غالب کی توہین کرنے کے سلسلے میں مقدمہ چلایا گیا۔ عدالت نے انھیں عبور دریائے ادب کی سزا دی۔ ایک ممتاز نقاد کے گھر سے بیشتر ایسی کتابیں نکلیں جن پر ان کی تنقیدیں اور تبصرے شائع ہو کر ملک میں خاصے مقبول ہو چکے تھے، مگر ان تبصرہ شدہ کتابوں کے ورق تک نہ کٹے تھے تازہ ترین اطلاعات کے مطابق ان کو ان کے آبائی کتب خانے میں قید کر دیا گیا ہے اور ان کو ان تمام کتابوں کے ورق کاٹنے کی سزا دی گئی ہے۔ اطلاع ملی ہے کہ جب تک ساری کتابوں کے ورق نہ کٹ جائیں ان کو ان پر مزید تبصرہ کرنے کا لائسنس نہیں

ملے گا۔

شام کی خبروں پر گرفتار ہونے والوں کی جو فہرست شائع کی گئی تھی اس میں اچھی خاصی تعداد اُن بزرگوں کی ہے جنھوں نے ادب کے منصب اپنے دوستوں، رشتہ داروں، ہم وطنوں، میں تقسیم کر کے حقداروں کو ان کے حق سے محروم کر دیا تھا۔ یہ سب اب فوجی حراست میں ہیں۔ ان کی ضمانتیں نامنظور کر دی گئی ہیں۔ بہت ممکن ہے کہ اپنی تحریروں کی تردید شائع کرنے پر ان کی سزاؤں میں تخفیف کر دی جائے۔ مگر ان لوگوں کی سزا میں کمی نہیں کی جائے گی جنھوں نے خود لکھ لکھ کر اپنے خاندان کے لوگوں کو شاعر و ادیب بنانے کی وقتی کوششیں کی تھیں ان میں ایسے لوگ بھی تھے جو موقع پانے پر حربہ کرنے سے بھی نہیں چوکتے تھے۔ اور ہمیشہ گمنام ناموں سے دوسروں پر مضامین اور تخریبی خطوط لکھ لکھ کر رسائل کے ذریعہ کیچڑ اچھالا کرتے تھے۔ ان لوگوں کے لیے فوج نے نہایت کلاسیکل قسم کی سزا مقرر کی ہے ایسے تمام لوگوں کو گدھے پر سوار کرا کے مع اُن کے اصلی نام کے سائن بورڈ کے روزانہ صبح و شام ہوا خوری کے لیے بھیجا جائے گا اور عبرت ہونے پر ان کو اصلی نام سے لکھنے کی اجازت دے دی جائے گی۔ ان لوگوں کو جنھوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے فیشن کے مطابق لکھے لکھائے اور پامال مضامین کو پھر سے باندھ کر اور بھی پامال کر دیا تھا، ان پر سب سے سنگین الزام یہ ہے کہ ان کی مستقل تصنیف ایک بھی نہیں، ان کی سزا اس وقت مکمل سمجھی جائے گی جبکہ وہ جیل سے ایک مستقل تصنیف پیش کر دیں گے۔

ایک صاحب پر یہ الزام ہے کہ وہ بالکل معمولی سی بات کو غیر معمولی طول دے کر

لکھتے ہوئے پکڑے گئے، غیر معمولی طوالت نے مسئلے کو جو سلجھایا ہوا تھا، تفصیل میں ڈبو کر خاصا الجھا دیا تھا۔ ان کو اس حرکت پر گرفتار کر لیا گیا ہے۔ ان پر پبلک کا وقت اور دماغ خراب کرنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا، فی الحال ان کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ اپنی جملہ ضخیم تصانیف کو مختصر کرنے کا کام شروع کر دیں۔ جس کتاب کی تلخیص پیش کرنے میں وہ ناکام رہیں گے وہ ضبط کر لی جائے گی۔ ایک دوسری اطلاع کے بموجب آج کل جیل میں ان سے مختصر نویسی کی مشقت لی جارہی ہے۔

ایک دوسرے محترم چلتی ٹرین میں کچھ لکھتے ہوئے پکڑے گئے۔ ان کے پاس تلاشی لینے پر بھی کچھ برآمد نہ ہو سکا۔ وہ جو کچھ لکھ رہے تھے اس میں محض پچھلی پڑھائی اور حاضر دماغی کا فتور پایا گیا۔ اعلانیے میں کہا گیا ہے کہ وہ ریڈیو ٹاک تھی اور اس قسم کے معرکے وہ بلا پڑھے لکھے مسلسل بیس سالوں سے انجام دے رہے تھے۔ ان کی مصروفیات کے پیش نظر عملاً اب یہ ممکن نہیں کہ وہ لکھ پڑھ سکیں۔ اندازہ ہے کہ اب تک انھوں نے جتنی ٹاک دی ہیں ان کے سلسلہ میں ایک مزید ٹاک کے ذریعہ پبلک سے باقاعدہ معافی منگوائی جائے۔ فوج نے ان کے اوپر فریب دہی اور آنکھوں میں دھول جھونکنے کے سلسلے میں مقدمہ قائم کر دیا ہے۔ چھان بین ہو رہی ہے، توقع ہے کہ اس قسم کی گرفتاریاں اور بھی جلد ہی عمل میں آ جائیں گی جن سے پھر ایک "ریڈیو سیریز" —"معافی ہی تو ہے" کے سلسلے میں نشریہ پروگرام ہوا کرے گا۔

ایک بزرگ جو روپوش ہو گئے ہیں۔ ان پر مغربی تصانیف کے حوالے اور غیر زبانوں کے الفاظ کی بھرمار کے سلسلے میں باز پرس کی جائے گی۔ ان کو عدالت میں

حاضر ہونے کے بعد بطور ضمانت ایک مقالہ خالص اردو میں لکھ کر دینا ہوگا۔

گرفتار ہونے والوں میں سب سے دلچسپ ایک بزرگ ہیں جو "تحقیق لفظ ل" کے اوپر ہزار صفحات جہازی کا ایک مختصر رسالہ تصنیف کرتے ہوئے پکڑے گئے، سارا طومار اس بات پر تھا کہ "ل" عربی ہے یا "ترکی"؟ ان پر یہ الزام ہے کہ جب تک وہ اختلاف کا پہلو پیدا نہ کرلیں قلم نہیں اٹھاتے۔ ان پر نقض امن اور پیپر کنٹرول ایکٹ کی خلاف ورزی کرکے کاغذ خراب کرنے کے سنگین الزامات ہیں۔ فوجی وکیل کا کہنا ہو کہ جو بات یہ لکھ رہے تھے اور نہ جانے کب تک لکھتے رہتے یہ بات تو دو لفظوں میں بھی بیان کی جاسکتی تھی کہ "آیا .... ہے .... یا .... نہیں ہے؟"

کچھ بزرگوں نے شہرت حاصل کرنے کے لیے گمنام شعراء اور ادیبوں کے خطوط شائع کرنے شروع کر دیے تھے، ان پر الزام یہ تھا کہ جب ان شعراء کا کلام خراب تھا تو پھر تفصیل سے ان کے حالات بیان کرکے ان کو بدنام کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ادیبوں کے خطوط شائع کرنے والوں پر فی الحال "ڈیڈ لیٹرس آفس" میں داخلے پر پابندیاں عاید کر دی گئی ہیں۔

بہت سے ایسے بزرگوں کا انکشاف ہوا جو اس انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی ادیب یا شاعر مرے تو اس پر کچھ نہ کچھ لکھیں۔ کچھ اور نہ سہی تو تاریخ وفات ہی سہی، ان لوگوں سے یہ وعدے لے کر چھوڑ دیا گیا کہ وہ آئندہ صرف زندہ لوگوں پر لکھنے کے مجاز ہوں گے۔

وہ ادیب جو جدید اور قدیم کے سلسلے میں تنقیدیں پڑھ پڑھ کر الجھ گئے تھے۔ ان کو فی الحال نئے قانون کے مطابق اس وقت تک اپنے خیالات کے اظہار کی

اجازت نہ ملے گی جب تک کہ وہ جدید اور قدیم کے گہرے مطالعے کے بعد اپنی فکر اور اظہار میں ایک توازن نہ پیدا کر لیں۔ اس درمیانی وقفے میں ہر قسم کے بحث ومباحثہ سے ان کا سخت پرہیز کرایا جائے گا۔

ایک مشہور و معروف نقّاد اور ان کے غیر معروف شاگرد جو تنقید میں قتلِ عام کے قائل تھے، عدالت میں انھوں نے حلف اٹھایا کہ زندگی بھر وہ کسی کی ایک لفظ بھی تعریف نہ کر سکے، اگر ایک جملے میں تعریف بھی کی تو اگلے پیراگراف میں تکذیب بھی کر دی، ان کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ اب بقیہ تمام زندگی اُن تمام ادیبوں، شاعروں، اور نقادوں کو جن کو وہ اپنے قلم سے بے ہوش کیا کرتے تھے ہوش میں لانے کے لیے اُن کی خوبیاں تلاش کریں، خصوصاً جن سے وہ ذاتی طور پر خوش نہیں ہیں اُن کی خوبیاں بر سرِ عدالت تحریری صورت میں سب سے پہلے پیش کریں اور اپنا ایجاد کردہ دل آزار طریقۂ تنقید فوراً بند کر دیں۔ ایک اطلاع یہ بھی ملی ہے کہ شاید جلد ہی ان کو کسی مشرقی کتب خانے میں قید کر دیا جائے جہاں ان کو مشرقی ادب پاروں کو خالص مشرقی انداز سے پرکھنے کی مفت تربیت دی جائے گی۔ جس کے انتظامات ہو رہے ہیں۔ پکڑے جانے والے افسانہ نگاروں میں زیادہ تعداد ان کی ہے جو قاری کو، اجنبی سرزمینوں میں لے جا کر اجنبی کرداروں سے ملواتے تھے اب غالباً ان سے دیسی کرداروں کے روزمرہ کے مسائل کی عکاسی کروائی جائے گی، بہت سے افسانہ نگاروں پر یہ الزام تھا کہ جب تک اس دن کا اخبار نہ پڑھ لیں افسانہ نہیں لکھ سکتے، اور جب تک اس دن کا اخبار نہ پڑھ لیا جائے جس دن افسانہ لکھا گیا تھا، موضوع کے ہنگامے کا قاری کے ذہن میں آنا ممکن نہیں، ایسے

افسانہ نگاروں کو اس روش سے بچ کر چلنے کی ہدایت کے ساتھ حکم دے دیا گیا ہو کہ وہ اپنی جملہ تصانیف کے ساتھ "ببلوگرافی" کا بھی اضافہ کر دیا کریں، تاکہ ہنگامے کا پتہ چلانے میں آسانی ہو۔ خاصی تعداد اُن کی ہے جو کسی نہ کسی سے بُری طرح متاثر تھے ان کی انفرادیت واپس لانے کے لیے شاید اب ان کو سب سے الگ تھلگ رکھا جائے گا۔

ایک مشہور افسانہ نگار جن پر الزام ہے کہ جب تک وہ راہ چلتے مونگ پھلی کھاتے، دہی بڑوں کے پتے چاٹتے، بیڑی پیتے، سڑکوں پر آوارہ گھومتے، فاقہ مستی کرتے اور معمولی ملازمت کرتے تھے بڑے شاندار افسانے لکھا کرتے تھے، مگر جب سے ان کو عزت، شہرت اور دولت ملی، وہ فلمی دنیا میں چلے گئے تو جاتے وقت وہ ساتھ میں اپنا قلم بھی لیتے گئے، جب سے اب وہ خراب سے خراب افسانے لکھنے کی مشق کر رہے ہیں۔ چنانچہ ان کو مجبوراً اسی معمولی ملازمت پر اس تنبیہ کے ساتھ واپس بھیج دیا گیا ہے کہ اگر اب بھی اچھے افسانے نہیں لکھے تو آئندہ ان کو اس سے بھی معمولی نوکری پر تعینات کیا جائے گا۔ ایک ان سے بھی زیادہ ممتاز افسانہ نگار جو کسی زمانے میں تار گھر میں کلرکی کرتے اور شاندار افسانے لکھتے تھے۔ شہرت اور دولت راس نہ آنے پر ان کو بھی "فلمیریا" ہو گیا تھا۔ انھوں نے پڑھنے لکھنے سے توبہ کر لی اور بالکل اچھے ہو گئے، ان کو وارننگ دے دی گئی ہے کہ اگر انھوں نے جلد ہی اسی پیمانے پر افسانہ نگاری نہ شروع کر دی تو ان کے پرانے تار گھر ان کو بذریعہ تار واپس بلا لیا جائے گا۔

اسی ضمن میں ایک معززہ افسانہ نگار خاتون بھی آتی ہیں جو پہلے کسی اسکول میں استانی تھیں اور غضب کے افسانے لکھا کرتی تھیں، مگر جب سے انھوں نے کسی فلم ساز سے

شادی کرلی اور فلمی دنیا سے لاکھوں روپے کمانے لگیں، تب سے وہ اپنی افسانہ نگاری کی جانب سے غافل ہوگئی ہیں۔ ان استانی جی کو ان کے پرانے اسکول میں وہی ایک سو بیس روپیہ ماہوار والی پرانی جگہ پر واپس بھیجنے کے فوج انتظامات کر رہی ہے۔ ویسے ان سب پر "بہ حیثیت مجموعی" دولت اور شہرت کے پاس نہ آنے کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے گا۔

کرنل آفریدی اور کیپٹن وحید نے بالکل نئے قسم کے ادیب گرفتار کر لیے ہیں۔ جن کے اوپر مستقل سنسنی خیز کرنے کا الزام ہے۔ ان لوگوں نے بتایا کہ وہ جاسوسی اور سائنسی ادب پیدا کر لیتے ہیں، تحقیقات سے پتہ چلا کہ سائنس ان کے خاندان میں کسی نے نہیں پڑھی۔ اس وجہ سے وہ بہ آسانی سائنسی ادب پیدا کر لیتے ہیں۔ ان میں ایک صاحب "لاشوں کا پہاڑ" بناتے ہوئے پکڑے گئے، دوسرے صاحب "بے گناہ قاتل" کو جنم دیتے ہوئے گرفتار کر لیے گئے۔ ان سب کو سنسنی خیز کرنے، راتوں کی نیند حرام کرنے، بھوک پیاس اڑانے، مار دھاڑ، قتل، چوری، اغوا، ڈاکے سے رغبت دلانے، اخلاق خراب کرنے اور گھر سے بھاگنے کی تربیت دینے کے الزام میں مقدمے چلائے جائیں گے۔ ان میں ایک صاحب اپنے ہیرو کو روحوں کی دنیا میں پہنچانے کے لیے خون کے دریا بہاتے ہوئے اور ہیروئن کی تلاش میں پولیس کو پریشان کرتے ہوئے پکڑے جانے کے الزام میں ماخوذ ہیں۔ ان کے پاس سے بڑی تعداد میں خام افیون، اس کو کشید کرنے کے آلات اور قدیم مصری جادو سے متعلق کچھ نقلی کتابیں اور کچھ انگریزی کے جاسوسی ناول بھی برآمد کیے گئے جو ان کی شہرت کا اصلی باعث تصور کیے جا رہے ہیں۔ جیل میں ان سب سے انسانوں اور انسانی مسائل پر لکھنے کی جبری

مشق کرائی جائے گی۔

شاعروں کے بارے میں جو سنسنی خیز انکشافات ہوئے ہیں ان سے ان کی چال اور نقل و حرکت پر بخوبی روشنی پڑتی ہے، زیادہ تر اس وقت حراست میں ہیں۔ بقیہ کی تلاش جاری ہے، شعراء دوسروں کی زمینوں میں شعر کہتے، چائے خانوں یا مے خانوں میں' دین و دنیا، بیوی بچوں سے ایک دم غافل پائے گئے۔ ان میں شاعر کم اور شاعر کے بھیس میں زیادہ تھے۔ فوج کی جانب سے ایک اعلانیے میں بتایا گیا ہے کہ منجملہ "بوہیمین شعرا" فوراً اپنے آپ کو انسان ثابت کرنے کی کوشش کریں۔ فی الحال جو شاعر کماتا نہ ہوگا بیوی بچوں کو ٹھیک سے نہ رکھتا ہوگا، اس کا کلام بھی فوج ضبط کر لیا جائے گا۔ اس کے علاوہ ان کو اپنے "دوادین" کی اصلاح، نظرثانی اور مختصر کرنے کا حکم دے دیا گیا ہے۔ دوسروں کی زمینوں میں لکھنے اور دوسروں کے رنگ کو اپنانے والوں کے کلام کو دریا برد کیا جا رہا ہے۔ جو شعرا غزل کی گردن مارنے پر تیار رہتے تھے ان کو اب صرف غزل ہی لکھنے کا لائی سنس مل سکے گا، اور آزاد نظم کے پرستاروں کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ غزل کی مخالفت بند کر کے نظم کی نزاکتوں کو سمجھنے کی کوشش شروع کر دیں۔ شعراء کو خبردار کیا گیا ہے کہ وہ آبادیوں کے باہر ویرانوں میں جانا اور آبادیوں کو کوسنا فوراً بند کر دیں۔ مسلسل اور طویل نظمیں، غزلیں خلاف قانون قرار دے دی گئی ہیں۔

ادب کے شمالی گوشوں سے خبر آئی ہے کہ وہاں بکثرت واہ واہ کرنے والے گرفتار کر لیے گئے ہیں جو شاعروں میں صرف آواز پر داد دیتے تھے مشاعروں پر شعراء اور انتخاب کی ۔۔ لازمی قرار دے دی گئی ہے۔ مزید شعراء کو گرفتار کرنے

کے سلسلے میں نئی انجال فوج نے معذوری کا اظہار کر دیا ہے۔ کیونکہ اس طرح آبادی اور فوج کا بیشتر حصہ حراست میں آجائے گا۔ اس لیے ان پر قاعدے قانون کی سختی کردی گئی ہے، شعرا کو حکم دے دیا گیا ہے کہ وہ محض شاعر نہ بنیں بلکہ کام کے آدمی بھی بنیں، گلے بازی کو سخت جرم قرار دے دیا گیا ہے۔

ایک شاعر رسالے کو غزل بھیجتا ہوا پکڑا گیا۔ اس پر یہ الزام ہے کہ اس نے خود اپنے آپ کو اپنے ہاتھوں سے "علامہ" ——— اور ——— "ایشیا کا عظیم ترین شاعر" وغیرہ لکھا تھا ان پر دوسروں سے بھی جبراً اپنے آپ کو عظیم شاعر کہلوانے اور خلاف مرضی تعریفی اداریے لکھوانے کے جرم میں مقدمہ قائم کر دیا گیا ہے۔ ایک اور شاعر جو کسی اعلیٰ عہدے پر فائز تھے اپنے اسٹینو سے خود اپنی ہی شان میں تنقیدی مقالہ لکھواتے ہوئے بروقت پکڑ لیے گئے۔ کیونکہ وہ شاعر خراب ہیں اور مقالہ اچھا تھا اس لیے اس کو ضائع کر دیا گیا۔ تلاشی لینے پر ان کے قبضہ سے کافی مقدار میں اس قسم کے جبریہ قصائد برآمد ہوئے۔ ایک نیوز بلیٹن میں تمام ماتحتوں کو حکام پر لکھنے سے باز رہنے کی تلقین کرتے ہوئے اس کو سخت جرم قرار دے دیا گیا ہے۔ خلاف ورزی کرنے والے ماتحتوں کو آگاہ کر دیا گیا ہے کہ آئندہ اگر وہ اس پر عمل نہ کر سکے تو ان کو سزا کے طور پر افسر بنا دیا جائے گا۔ اس قسم کے تمام گرانقدر مضامین کی تلاش ان کو ضائع کرنے کے لیے برابر جاری ہے۔

ایک ممتاز شاعر پر یہ الزام ہے کہ جب تک وہ جیل میں تھے بہت اچھی چیزیں کہتے تھے، مگر جب سے جیل سے رہا ہوئے ہیں تقریباً خاموش ہیں۔ چنانچہ اس تدبیر میں کہ وہ دوبارہ اسی زور وشور سے شاعری شروع کر دیں ان کو پھر جیل خانے روانہ

کر دیا گیا ہے۔ ایک بزرگ ترین شاعر جن کے اوپر الزام ہے کہ جب اقبال واصغر وغیرہ نے شاعری شروع کی تھی تب وہ ان کو باقاعدہ اپنا معاصر و حریف خیال کر کے ان کی خیالی مخالفتیں کرتے رہتے تھے اور ہر پہلو سے ان کو اپنے سے کمتر درجے کا شاعر ثابت کرنے پر اپنی ساری توانائی صرف کر دیتے تھے اور اب وہ فیض اور اُن کے بعد کی نسل تک کے ہر ایک نئے شاعر کو اسی پیمانے پر اپنا حریف سمجھتے ہیں۔ ان کو خبردار کر دیا گیا ہے کہ وہ ادبی معرکوں اور دنگلوں میں جو وقت ضائع کر دیا کرتے ہیں اس کو اپنی شاعری پر صرف کر کے اس کو بہتر بنانے کی کوشش کریں۔ اس سلسلے میں ان کو اصلاح کا آخری موقع دے دیا گیا ہے، مگر اس شرط پر کہ یا تو شرط منظور کریں ورنہ اپنے کو مردہ اعلان کر کے لکھنا چھوڑ دیں۔

کرنل مشفق الرحمن نے کئی ممتاز مزاح نگاروں کو حراست میں لے لیا۔ جن پر یہ الزام ہے کہ اُن کے مزاحیہ مضامین پڑھ کر ہنسی کبھی نہیں آئی، رونا تو دور کی بات ہے۔

انٹی کرپشن ڈپارٹمنٹ نے کچھ ایسے ادیبوں اور شاعروں کو بھی گرفتار کیا ہے جو پیسے کمانے کے لیے دوسروں کے ناموں سے الٹا سیدھا لکھتے تھے یا ان کو مرے ہوئے ادیبوں کے نام سے منسوب کر کے غلط فائدہ اٹھاتے تھے۔ ان کو چار سو بیس کرنے کے جرم میں سزائیں دی جائیں گی۔ محکمہ نے چند ایسے صحافیوں کو بھی حراست میں لے لیا ہے جو مخالفت کر کے بحثیں چلا کے، خواہ مخواہ ایک دوسرے پر کیچڑ اچھلوا کے روپیہ کماتے تھے اور محض روپیہ کی خاطر ہر اچھی چیز کی مخالفت کرتے تھے تاکہ پڑھنے والے چونک اٹھیں اور اسی بہانے ان کا رسالہ چل نکلے، اکثر نے اپنے نام و شہرت کے

ناجائز فائدہ اٹھا کر اپنی کتابیں ردّی کاغذ پر چھاپ چھاپ کر کوڑیوں میں اشرفیاں کمائی تھیں۔ ان سب کی ضمانت کے لائسنس ضبط کر کے ان کو حوالات میں بند کر دیا گیا ہے۔ محکمہ نے ان موسمی ادیبوں پر رسالہ نکالنے کی ممانعت لگا دی ہے جو اس وقت تک ادیب رہتے ہیں جب تک ان کا رسالہ نکلتا رہے۔ اس کے بعد وہ بھی رسالے کی بلیٹن کے ساتھ میدان سے غائب ہو جاتے تھے، سزا کے طور پر ان کو اب بلا رسالہ کے میدان میں لایا جائے گا۔ اینٹی کرپشن والوں نے ایسے بہترین ادب کے انتخاب کرنے والے برآمد کیے ہیں جو ہر سال اس وجہ سے خود انتخاب کرتے تھے تاکہ ان کی چیزیں بھی انتخاب میں آجائیں۔ یہ انتخاب ضائع کر دیے گئے ہیں اور اب اینٹی کرپشن والے خود اپنی نگرانی میں نئے سرے سے سارے انتخاب کر رہے ہیں، سزا کے طور پر ان لوگوں کی کوئی چیز انتخاب میں شامل نہیں کی جائے گی۔ آج شام کو اینٹی کرپشن والوں نے ایسے ادیب بھی گرفتار کیے ہیں۔ جو ہر سال دوڑ دھوپ کر کے اور تعلقات کے بل بوتے پر غلط کتابوں پر (سال بھر میں شائع ہونے والی بہترین کتابوں) انعام حاصل کر لیتے تھے۔ ان سب کی ضمانتیں اس وقت تک منظور نہیں ہوں گی جب تک کہ وہ انعام کے روپے واپس اور جرمانہ ادا نہ کر دیں۔ محکمہ نے ایک ادیب کے گھر دوڑ بھیجی وہ نرا شاعر نکلا جو اس وقت اپنی بیوی پر رعب جمانے کے لیے سوائے اپنے سارے شاعروں اور ادیبوں کو جاہل ثابت کرنے کے علاوہ اپنا کلام بے لگام بھی متواتر سنا رہا تھا جسے سُن سُن کر بیوی بیچاری بہت بور ہو رہی تھی۔ ان کو گرفتار کر لیا گیا۔ ان کو لے جاتے وقت بیوی نے فوج کا شکریہ ادا کیا۔

اس کے بعد ہوٹلوں اور جوا خانوں پر چھاپے مار کر بہت سے شاعر اور ادیب

دوسروں کی غیبت کرتے ہوئے گرفتار کرلیے گئے۔ بگڑے جانے والوں میں بہت سے "انٹلیکچول" جو کافی ہاؤس میں آفاقی ادب کے سلجھے ہوئے مسائل کی بحثوں میں الجھے ہوئے تھے۔ ان پر اینٹی کرپشن والوں نے دو الزامات عاید کیے ہیں۔ ایک تو زیر بحث موضوع سے متعلق جن کتابوں کے حوالے دیے جارہے تھے یا تو وہ زیر طبع تھیں یا ابھی تک پڑھی نہیں گئی تھیں، دوسرے سب ایک دوسرے پر اپنی قابلیت اور علم کا غلط سکہ جمانے کی ناکام کوشش کر رہے تھے، ان کے خلاف پبلک سیفٹی ایکٹ کے تحت مقدمہ چلایا جائے گا، فی الحال کافی ہاؤس میں ان کے داخلے پر پابندی عاید کردی گئی ہے۔ ایک حالیہ اعلان میں محکمہ نے ان تمام نوجوانوں کو اُن کے کام پر واپس جانے کا حکم دے دیا ہے جنھیں "ادب" ہوگیا تھا۔ یعنی وہ کرتے کچھ اور تھے اور رہتے ادب کی جان پر سوار تھے اور اپنے کام کے ساتھ ادب کی بھی مٹی پلید کیے ہوئے تھے۔

موجودہ انقلاب اور اصلاحات کا ہر حلقۂ ادب میں بے پناہ استقبال کیا جارہا ہے۔ ادب میں انتشار پیدا کرنے والے اب تقریباً منتشر ہو چکے ہیں۔ ادب میں ایک توازن سنجیدگی اور پایٔداری کی ہر طرف امید کی جارہی ہے" ادبی جمود" کا نعرہ لگانے والے "مارشل لا" کے طفیل میں اب مقالے لکھ لکھ کر ثابت کر رہے ہیں کہ ادب میں نہ کبھی جمود تھا اور نہ ہے۔ آگے چل کر " ادبی مارشل لا" کا دور تاریخ ادب میں ادب کے سنہری دور کے نام سے یاد کیا جائے گا جس میں زیادہ تر عظیم اور صالح ادب تخلیق ہوا۔ اور تمام بنیادی کام انجام دیئے گئے۔

یونی ورسٹی کے لڑکے

صاحب لڑکوں کی تو آج کل بھرمار ہے، جدھر دیکھئے لڑکے ہی لڑکے نظر آتے ہیں گویا خدا کی قدرت کا جلوہ یہی لڑکے ہیں. گھر اندر لڑکے، گھر باہر لڑکے، پاس پڑوس میں لڑکے، محلہ محلہ لڑکے، گاؤں اور شہروں میں لڑکے، صوبے اور ملک میں لڑکے غرضکہ دنیا بھر میں لڑکے ہی لڑکے، جہاں تک نظر کام کرے گی لڑکے ہی لڑکے دکھائی دیں گے اور جہاں تک نظر کام نہ کرے گی وہاں کا کیا کہنا کیونکہ وہاں تو لڑکے ہوں گے ہی۔

یوں تو ان کی کاشت ہر موسم، ہر آب و ہوا اور ہر ایک ملک میں کی جاتی ہے لیکن آپ جانیے ہر ملک کی روایات الگ الگ ہوتی ہیں، اور اسی میں شان ہے، ہمارے ملک کی شان چونکہ سب سے الگ ہے لہذا دنیا بھر میں لڑکوں کی کاشت کے اعتبار سے ہمارا ملک سب سے زرخیز واقع ہوا ہے، یہاں کے باشندوں نے بنجر مقامات پر بھی ان کی کاشت کر کے ملک کو زرخیز و مالا مال کر دیا ہے۔ اس کے

بارے میں کچھ ماہرین کا خیال ہے "زیادہ غلہ اگاؤ" کی تحریک کو جب سے "زیادہ لڑکے پڑھاؤ" میں سمویا گیا ہے تب سے یونی ورسٹیاں لڑکوں سے کھچا کھچ بھرنے لگی ہیں اور یہ تحریک بھی سول نافرمانی والی تحریک کی ایک کڑی ہے۔ اب چاہے یہ کڑی ہو یا دھنی ہم کو اس سے مطلب نہیں، یہ سب بزرگوں کی باتیں ہیں، ان میں دخل دینا فطرت کا مذاق اڑانے اور چھوٹا منہ بڑی بات کے مترادف ہوگا، احوالِ واقعی یہ ہے کہ ہم سے کچھ لوگوں نے فرمائش کی ہے کہ صاحب ہم نے گھاٹ گھاٹ کے لڑکے دیکھے ہیں، شریف لڑکے لوفر لڑکے، اور ایسے لڑکے جیسے کہ خود لڑکے ہوتے ہیں، مگر نہیں دیکھے ہیں تو یونیورسٹی کے لڑکے نہیں دیکھے ہیں، خدارا ہماری جنرل نالج میں کچھ اضافہ کیجیے، اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہماری یونیورسٹی ایک ایسا مقام ہے جہاں بھانت بھانت کے لڑکے ہیں۔ جن کی مختلف قسمیں ہیں اور ان قسموں کے مختلف کلی پھندنے ہوتے ہیں۔ لڑکے یونیورسٹی میں اتنی بھاری تعداد میں کیوں آتے ہیں؟ اتوار کے دن کیوں نہیں آتے؟ دن کو کیوں آتے ہیں رات کو کیوں نہیں آتے؟ ہاسٹل میں کیوں رہتے ہیں گھر پر کیوں نہیں رہتے جب کہ گھر موجود ہیں؟ تو جناب من یہی وہ مسائل ہیں جن کے سمجھنے کے لیے اس یونیورسٹی میں بے شمار کمیٹیاں بنائی اور بگاڑی گئیں، ان کمیٹیوں نے اپنی اپنی رپورٹیں بھی پیش کیں جنھیں یونیورسٹی کے ذمہ داروں نے نہایت ایمانداری کے ساتھ ردی کی ٹوکری کی نذر کر دیا، کیونکہ ذمہ داروں کا دعویٰ ہے کہ وہ ان رپورٹوں کے ذریعہ کسی صحیح نتیجہ پر پہونچنے سے قاصر رہے، پتہ چلا ہے کہ وائس چانسلر صاحب نے ان میں سے بعض مسائل کو رجسٹر پر چڑھا لیا ہے اور وہ اس سلسلے میں جلد ہی ایک دستخطی مہم چلانے والے ہیں۔ جس سے پہلے وہ خود چلنے کی مشق کریں گے، کیونکہ

اپنی مشق مزدوری ہوتی ہے۔ کاغذ کا کیا اعتبار آج ان کے ہاتھ میں کل ردی کی ٹوکری میں ہو۔ ورنہ ہمارے ہاتھ میں ہوگا، ہم سر کرنے والی پارٹی کے صدر اور نیجر خود وائس چانسلر صاحب ہوں گے۔ تمام پروفیسرز، طلبا، اور ڈین ان کے گلے میں ہار پھول ڈالیں گے۔ احتیاطاً الوداعیہ بھی پیش کیا جائے گا۔ کیونکہ ہم کا معاملہ ہے خدا جانے کیا ہو کیا نہ ہو۔ میاں سب تقدیر کے پھیر ہیں۔ ہم سر کرنے سے کچھ دیر پیشتر تمام یونیورسٹی بھر میں سائرن اور گھنٹے بار بار بجیں گے۔ اگر ممکن ہوا تو ملٹری سائنس ڈیپارٹمنٹ حکومت سے عارضی طور پر کچھ توپیں بھی حاصل کرے گا تاکہ گارڈ آف آنر دیتے وقت کچھ ہوائیاں بھی سر کی جائیں۔

اب آپ لوگ غالباً سمجھ گئے ہوں گے کہ دور کے ڈھول کس طرح سہانے ہوتے ہیں جبکہ خود ہمارے مسائل اس قدر سہانے نہیں ہیں۔ رہا لڑکوں کا سوال تو اطلاعاً عرض کیا جا چکا ہے کہ ان کی مختلف قسمیں اور مختلف شکلیں ہوتی ہیں۔ ان میں سے پہلی قسم "حوالی طلبا" کی ہے جو اسی نام سے مشہور بھی ہے۔

خود ان طلبا کے بارے میں اب تک یہ طے نہیں کہ واقعی ان کا وجود ہے بھی یا صرف "حوالے کی کتابوں" کی طرح حوالے ہی حوالے ہیں۔ ان طلبا کو یونیورسٹی کے ناخدا، لارڈ، منکر نکیر اور کراماً کاتبین بھی کہا جا سکتا ہے۔ یونیورسٹی میں ہونے والے کھیل تماشے، مشاعرے، قوالی، ناچ گانے، ہلکے پھلکے پروگرام، جلسے، جلوس وغیرہ کے یہ سولہ آنے ذمہ دار ہوتے ہیں۔ ان کے نام سے یونیورسٹی بھر واقف ہوتی ہے۔ آس پاس کے موچی ان کے نام لے کر اپنی دوکانیں سڑکوں کے کنارے جاتے ہیں۔ بات بات میں ان کی تصاویر اور بیانات اخبارات، ہینڈ بلس اور لیف لیٹس میں

اُچھلتے نظر آتے ہیں مگر یہ خود نہیں نظر آتے، گو کہ ان کا ذکر ہوتا ہے تمام انتظامی امور میں ان کا خاص و عام ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ تخت رہے یا تختہ کے قائل ہوتے ہیں مگر کچھ دشمنوں کا شک ہے کہ یہ لوگ فاتر العقل اور بوہیمین ہوتے ہیں۔ جبکہ ہمارا شک ہے کہ بات کچھ اور ہے اور جو شاید خود ہم بھی نہیں جانتے ورنہ آپ سے کیا پردہ تھا۔

ان طلباء کی پہچان یہ ہے کہ یہ آپ کو ہر وقت چلتے پھرتے نظر آئیں گے، مگر ان کے چلنے کے راستے مقرر ہیں۔ اگر آپ کو ان کی تلاش آنکھ بند کر کے کرنا مقصود ہو تو ہماری رائے میں آپ کامن روم کے سامنے چلے جائیے۔ یہی ایک ایسا پر فضا مقام ہے جہاں یہ لوگ موقع پاتے ہی تبدیلِ آب و ہوا کے لیے پہنچ جاتے ہیں۔ ویسے یہ شام کو حضرت گنج میں ہوا خوری کرتے نظر آئیں گے جہاں یہ میل روز، ایروز، اور کوالٹی میں اسی طرح کے انگریزی ہوٹلوں میں نقرئی قہقہوں سے اپنے کھوکھلے قہقہے ملاتے ہوں گے اور اگر آپ کو ان کی تمیز کرنا مقصود ہے تو آپ اپنی آنکھیں کھول کر ان کو بجائے تلاش کرنے کے ٹٹولیے، یہ کہیں نہ کہیں زور و شور سے کسی اہم مسئلے پر کسی نیم ریٹائر قسم کے بزرگ سے بحث کرتے ہوں گے۔ ان کے پیچھے بہت سے عقیدت مندوں کا ہجوم ہوگا۔ خاص بات یہ ہوگی کہ سب ان کا نام جانتے ہوں گے اور عام بات یہ ہوگی کہ یہ خود کسی کا نام نہ جانتے ہوں گے۔ یہ آپ کو کسی نہ کسی لیڈر، یا پروفیسر وغیرہ کو کسی ہونے والی میٹنگ کی صدارت کے لیے اُکساتے ہوئے ملیں گے۔ ہر تقریب میں آپ بہ آسانی ان کو صدر کے دائیں یا بائیں پہلو میں دیکھ سکتے ہیں۔

تمام مقابلے غالباً انہی طلباء کے لیے کروائے جاتے ہیں۔ امتحانات میں فرسٹ کلاس اور تھرڈ کلاس شاید ان ہی نے جاری کروایا تھا۔ غرضیکہ وہ محفل محفل نہ ہوگی

جہاں یہ پالا نہ مار لے جائیں، ہر لکھائی پڑھی کے کام میں ان کا نام سب سے اوپر ہوگا یا سب سے نیچے مگر ہو گا ضرور۔ یہ تھوڑا سا فرق جو فرسٹ کلاس یا تھرڈ کلاس میں پیدا ہو جاتا ہے وہ ان طلبا کی ستم ظریفی نہیں بلکہ خیالات کا ٹکراؤ ہے۔ کیونکہ کچھ طلبا کا خیال ہے کہ ٹاپ اوپر سے یعنی ٹاپ سے کیا جائے۔ اور کچھ کا خیال ہے کہ ٹاپ نیچے سے یعنی باٹم سے کیا جائے۔ ان کا اعتقاد اسی بات پر ہے کہ ناک ناک ہی ہوتی ہے چاہے ادھر سے پکڑو یا اُدھر سے۔ باقی جو کسر ٹاپ کرنے میں رہ جاتی ہے وہ یہ طلبا، ٹیپ ٹاپ سے پوری کر لیتے ہیں۔ ان کے ٹیپ ٹاپ کرنے کے بھی دو طریقے ہیں۔ کچھ طلبا کا خیال ہے کہ "اعلیٰ خیالات سادہ زندگی" جبکہ بقیہ طلبا کا خیال ہے کہ نہیں نہیں "اعلیٰ زندگی اور سادہ خیالات" ہونا چاہیے ۔۔ مگر پروفیسر اوٹ پٹانگ کا خیال ہے کہ یہ طے کرنا بہت مشکل ہے کہ خیالات اور زندگی میں کس کو اعلیٰ اور کس کو سادہ ہونا چاہیے۔

طلبا کے اس پہلے گروہ کے لوگ اُدھار اپنی حجامت بنواتے ہیں اور چپل ٹکواتے ہیں۔ اور جب ادھار کا سوال نزاکت اختیار کر جائے تو وہ راستہ ہی چلنا بند کر دیں گے اور اس طرح ان کی سادہ زندگی ان کے لیے نئی نئی راہیں پیدا کر دیتی ہے۔ یہ طلبا نہایت کفایت شعار ہوتے ہیں، اور کھدیا گاڑھے کو اپنا شیوہ قرار دیتے ہیں اور چلتے وقت اپنے چپلوں سے ایک خاص قسم کی آواز پیدا کرتے ہیں جس کو یہ "آزاد راگ" بتلاتے ہیں۔ اور ان کا دعویٰ ہے کہ آئندہ اس راگ کی وہی اہمیت ہوگی جو آج جلترنگ کی ہے۔ ان میں سے جو لیڈر نکل جاتا ہے وہ اسی بہانے اپنی حجامت اور شیو وغیرہ سے صاف بچ جاتا ہے، اور کم خرچ بالا نشین کا

مسئلہ اس طرح طے کرتا ہے کہ حجامت کا خرچ کم ہونے سے خرچ کم ہو جاتا ہے اور سر کے
اوپر بالوں کا ایک چھجا سا بنا کر (جس کو ہم بالاخانہ بھی کہہ سکتے ہیں اور بالکونی بھی) اس
کے نیچے اپنی کھوپڑی کو پناہ دے لیتا ہے۔

طلبا کا دوسرا گروہ پہلے والے گروہ سے مختلف ہوتا ہے، یعنی زندگی اعلیٰ پسند
کرتا ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے کہ آپ ان کے جوتوں میں جو شیشے سے زیادہ چمکدار ہوتے
ہیں بآسانی اپنا چہرہ دیکھ سکتے ہیں۔ یہ نہایت اعلیٰ قسم کے سوٹ پہنے ہوتے ہیں۔
جو ماٹ، چمڑے یا کینوس وغیرہ کے معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے چہروں کے بارے میں ہم
آپ سے کچھ نہیں کہہ سکتے ہیں کیونکہ ان کے منھ پہ آپ کو کریم، پاؤڈر، اور اسنو ملے گا
مگر چہرہ نہیں ملے گا، مگر ہاں اگر آپ نہار منھ، صبح سویرے ان کا منھ دیکھنا گوارا کریں تو
ممکن ہے ان کے چہرہ کی زیارت ہو جائے۔

ان طلبا کے بات چیت کے طریقے ان کے کھانے پینے کے طریقوں سے مختلف
ہوتے ہیں، مگر پھر بھی یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہ بات نہیں کریں گے بلکہ کھا جائیں گے۔ جب
کسی مسئلہ پر بات چیت ہوگی تو ایسا ظاہر کریں گے کہ بس ان کے جانے کی دیر ہے کہ گئے
نہیں کہ مسئلہ حل ہوا۔ حالانکہ ان سے مسئلہ حل ہونا ایک دوسرا مسئلہ ہوگا، مگر چونکہ ان کو
بات چیت کرنے اور خطاب کرنے کی لت ہوتی ہے اس وجہ سے ہمیشہ صرف بڑے بڑے
مسائل کو ہاتھ لگاتے ہیں اور بات کرنے میں برابر ہاتھ پیر ہلانے، گھونسہ دکھانے،
گردن ہلانے، کندھے اچکانے اور منھ چڑھانے سے بھی نہیں چوکتے۔

طلبا کی تیسری قسم وہ ہوتی ہے جن کو ہم "خیالی طلبا" کہہ سکتے ہیں، ان کے بارے
میں ہمارا خیال ہے کہ یہ یونیورسٹی پڑھنے کے لیے نہیں آتے بلکہ یونیورسٹی میں خیال کی رفتار

ے آتے جاتے رہتے ہیں۔ یہ طلبا ہمیشہ طوائف الملوکی میں مبتلا رہتے ہیں۔ ان کو درجوں سے سخت نفرت ہوتی ہے۔ کبھی کبھی یہ درجوں میں چلے جاتے ہیں۔ مگر چونکہ دل کے بالکل صاف ہوتے ہیں اور اپنی صفائی میں فرق نہیں آنے دیتے ہیں اس وجہ سے درجوں میں صرف سونے یا کسی کی تلاش کرنے کی غرض سے جانے کی تکلیف اٹھاتے ہیں۔ اور جیسے صاف جاتے ہیں ویسے ہی لوٹ آتے ہیں۔ کسی پروفیسر سے جب ٹکر لیتے ہیں جو عموماً ہو ہی جاتی ہے تو اس کو نہایت مزے لے لے کر بیان کرتے ہیں۔ ویسے ہوتے ہیں بہت اڑیل اور آسانی سے نہیں جاتے۔ عموماً جس کلاس میں ایک مرتبہ بھرتی ہوتے ہیں نہایت وضعداری سے چار پانچ سال تک اسی کلاس کو نبھاتے ہیں۔ دراصل ان کے منھ میں اس کلاس کا خون لگ جاتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہ اپنے بچوں کا انتظار کرتے ہوں کہ ان کو اپنے سامنے پڑھوانے کا موقع مل جائے۔ بہرحال ان کے یہاں دیر ہے اندھیر نہیں۔

ان طلبا کی نشست و برخاست یونی ورسٹی کے کافی ہاؤس، "انا پورنا" کیوڑز اور یونین ہال میں ہوتی ہے۔۔۔ ویسے یہ گھاس پھوس پر بھی پائے جاتے ہیں۔ یہ لوگ وقت گزاری کے لیے موٹروں میں بیٹھتے ہیں۔ جس کے پاس موٹر نہیں ہوتی وہ کوئی نہ کوئی موٹر تلاش کر لیتا ہے۔ خواہ اس کے لیے اسے ڈرائیور موٹر ہذا کی ڈانٹ پھٹکار سننا پڑے۔ یا اس کو سگریٹ پلانا پڑے۔ یہ طلبا کپڑوں کے بڑے شوقین ہوتے ہیں اس وجہ سے ان کے کپڑوں کی تعریف کرنا چراغ کو سورج دکھلانا ہے۔ ان طلبا کا صدر مقام گرلس کامن روم کے آس پاس کا علاقہ ہے جہاں یہ اس کثرت سے جمع ہوتے ہیں کہ رونق پیدا ہو جاتی ہے۔ اور اس کو یہاں کی زبان میں چہل پہل

یعنی چلنا پھرنا کہتے ہیں۔ یہ بات کرنے میں ایک دوسرے پر کڑی نظر رکھتے ہیں اور
لباس شناس ہوتے ہیں۔ ان میں کثرت اُن طلباء کی ہوتی ہے جو سال بھر ایک ہی
پتلون اور ایک ہی کوٹ کو استری سے رگڑ رگڑ کر اور ایک ہی ٹائی کو اُلٹ پلٹ کر
لگاتے ہیں۔ یہ کسی بات سے نہیں چوکتے، ہر موقع پر پورا فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ مثلاً
جاڑے کا موسم کیوں پسند کرتے ہیں۔ ان کو اس کا کیوں شدت سے انتظار رہتا ہے۔
صرف اس وجہ سے کہ جاڑے آتے ہی پھٹی ہوئی قمیصیں اور بنیائنیں استعمال کرنے کا
موقع مل جاتا ہے۔ جاڑوں میں کپڑے کم میلے ہوتے ہیں۔ پورا جاڑا ایک شیروانی
میں گزارا جا سکتا ہے۔ جس کے اگر سب بٹن لگا لیے جائیں تو قمیص کی بچت ہوتی ہے۔
مگر یہ تو اَن کہی باتیں ہیں۔ جو باتیں کہی جاتی ہیں وہ یوں ہیں۔

مثلاً ایک دوسرے کی کالر دیکھتے ہوئے کہے گا۔ "اوہو یہ قمیص تم نے کہاں
سلوائی۔ یہ تو ونڈسر کالر ہے جو فیشن سے منتی ہے۔ ہندوستان کی تو معلوم نہیں ہوتی"۔
—— اب صاحب کالر جنھوں نے قمیص خواہ گلی کے چھیٹن درزی سے سلوائی
ہو اکڑ کر جواب دیں گے ۔" صاحب یہ تو انگریزوں کی چیزیں ہیں یہاں کہاں
نصیب، وہ تو کہیئے انگلینڈ سے لوٹتے میں خاص طور پر میرے لیے بنوا کر حمید
بھائی لے آئے تھے"۔ —— اب ظاہر ہے کہ سارے مجمع پر سناٹا چھا جائے گا جس کو صرف
وہی مائی کے لال توڑ سکیں گے کہ جن کے دماغ میں اس قسم کے خانہ ساز واقعات
کا ذخیرہ ہو گا جس کو وہ اپنے باپ دادا یا کسی خان بہادر یا رائے بہادر قسم کے رشتہ دار
سے منسوب کر کے بیان کر سکیں۔ اگر جوتے پر بات چلی تو چائنیز شو سے شروع ہو کر
انگلینڈ کے موچیوں تک پہونچے گی —— "ارے صاحب میں تو دیکھتے ہی پہچان

گیا تھا یہ آکسفورڈ کا بنا ہوا جوتا ہے، ایسا کوئی یہاں ناپید ہے۔ اب تو گو ہتیا کے بعد
اور بھی نصیب نہ ہوگا۔ ترستے ہیں صاحب ترستے۔ جو لوگ آتے جاتے رہتے ہیں ان کی
مہربانی سے نصیب بھی ہو جاتا ہے۔ بھلا بتلایئے دو سو روپے کا جوتا ہے۔ تو کیا بات
ہوئی، پندرہ بیس سال تو ہلائے نہیں ہلے گا۔ جوتا کیا ہے لائف پارٹنر ہے، انگریز ہی
صاحب بنانا بھی جانتے ہیں اور پہننا بھی۔ کیا بات ہے صاحب انگریزوں کی بھی،
اچھا خاص بات یہ ہے کہ اس کی چمک میں کبھی فرق نہیں آتا۔ سلوٹ پر دنت ہے
سلوٹ پر دنت۔"

پھر ٹی سیٹس (TESSTES) کی ٹائیز کی تعریف شروع ہو جائے گی جس کا
نزلہ ڈبلو ڈی ایس اور لنڈن ٹیلرس کے سوٹنگ پر گرے گا۔ اس کے بعد موٹروں اور موٹر
سائیکلوں پر بات شروع ہو جائے گی۔ نئے موڈلوں کی RIGHT HAND DRIVE اور
LEFT HAND DRIVE کے راگ الاپنا شروع ہو جائیں گے، اور بات کرنے والے
اس وقت اپنی پرانی سائیکلوں کو بھول جائیں گے جن کی خوبی یہ ہے کہ چلتی ہیں تو معلوم
ہوتا ہے بلبل پال رکھی ہے جو نغمہ سرائی کرتی جا رہی ہے۔ کپڑوں کا ذکر کرتے وقت
سب ایک دوسرے سے اپنی پھٹی کالریں چھپاتے نظر آئیں گے۔ جب گارڈن پارٹیز اور
ڈنر کے ذکر ہوتے ہوں گے تو سب ایک دوسرے سے چھین چھین کر مونگ پھلی کھاتے
ہوں گے جس کا کوئی ذکر نہیں۔

چوتھی قسم ہوتی ہے ان طلبا کی جو "سرپھرے" کہلاتے ہیں آپ ان کو دیکھتے ہی پہچان
جائیں گے۔ ان کے دس کتابیں ادھر دس کتابیں ادھر بغل میں دابے نہایت
سنبھل سنبھل کر چلتے ہوئے نظر آئیں گے۔ یہ رہتے ہیں خیالات کی دنیا میں، بات

اشاروں میں کرتے اور چلتے پھرتے پرچھائیوں میں ہیں۔ یہ کتابیں پڑھنے کے لیے نہیں بلکہ بانٹنے کے لیے لاتے ہیں۔ تاکہ کچھ لوگ ان سے متاثر ہوں اور کچھ حیرت بکھیریں۔ ان کو موٹی موٹی کتابوں کے نام اور حوالے زبانی یاد ہوتے ہیں۔ جب یہ بات کرتے ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ کسی لائبریری کا چپراسی بول رہا ہے۔ عام طور پر نادان لوگ دل ہی دل میں ان پر پیچ و تاب کھاتے ہیں اور منھ پر انھیں برداشت کیے رہتے ہیں۔ جب یہ آپ سے مجبوراً بات کرنے کے لیے رکیں گے تو یہ آپ کو سر سے پیر تک ایک گہری نظر سے اس طرح دیکھیں گے جیسے کہ یہ کسی شیر خوار بچے پر شفقت کر رہے ہوں۔ آپ ان کے سامنے کسی بہت قابل آدمی کا نام لے لیجیے آپ کی مصیبت آجائے گی۔ فوراً بہت نفرت سے سنبھل سنبھل کر اور ٹھہر ٹھہر کر آنکھیں میچ میچ کر ناک بھوں سکوڑ کر بولیں گے "ہونہہ" پھر وہ آپ سے ان کی برائی شروع کر دیں گے۔ ان کا دن رات کا یہ کام ہے کہ دنیا بھر میں جو چیز بھی ہو اس کی ڈھونڈھ ڈھونڈھ کر برائی نکالیں گے۔ اگر مسکرانا چاہیں گے تو ہفتوں مسکرانے کے لیے زمین تیار کریں گے جی کڑا کریں گے اور آخر میں ناکام رہیں گے۔ ایسے لوگوں کی دنیا بھر تو شاگرد ہوتی ہے۔ اگر آپ ان کی تعریف نہ کریں تو بس غضب ہو جائے گا۔ آپ جاہل ہیں۔ آپ کیا سمجھیں۔ معاف کیجیے گا آپ سے ملنے کے لیے تو مجھے اپنا معیار گرا کر بات کرنا پڑتی ہے۔ اگر کوئی دیکھے تو آپ کا کیا جائے گا، میری مفت میں بدنامی ہوگی۔ اگر آپ ان کی تعریف کر دیں تو یہ سمجھیں گے کہ بیوقوف بنا رہا ہے۔ اگر آپ ادب کریں تو یہ آپ کو بازار پان لینے کے لیے بھیج دیں گے۔

دراصل یہ بے چارے اس درجہ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ دوسروں کی پگڑی اچھالنے میں اپنی تسکین کا سامان پاتے ہیں۔ دنیا بھر کے تمام آرٹ

ان لوگوں کے سامنے ہیچ ہوتے ہیں۔ یہ ہر وقت بڑے بڑے علماء کی تقریروں اور تحریروں پر نظر ثانی کرتے رہتے ہیں اور ان کی اصلاح کی فکر میں دبلے اور بیمار رہتے ہیں۔ یہ بے چارے صبح سے شام تک نہایت محنت سے دشمن پیدا کرتے ہیں، جو دراصل ان کی متاعِ عزیز ہوتی ہے۔ ان کا عقیدہ ہے کہ لڑائی جھگڑے سے بحث و مباحثے کے نئے نئے پہلو نکلتے ہیں۔ مگر اس سلسلے میں اکثر مار بھی کھا جاتے ہیں اور اپنے کسی خاص عزیز کو دنیا کا سب سے بڑا آرٹسٹ مان کر اس کو اپنا آئیڈیل قرار دیتے ہیں۔ یہ صبح سے شام تک اس کا ڈھنڈھورا پیٹتے رہتے ہیں، جن کا جنون خرد کی سرحدوں کو پار کر جاتا ہے وہ اپنے کو فلسفی کہلوانے کے خبط میں طرح طرح کے صدمے اٹھانا شروع کر دیتے ہیں۔ مگر اعتبار ان کو اپنے باپ پر بھی نہیں ہوتا۔ اس اعتبار سے صدمے اٹھاتے اٹھاتے ان کا مزاج عاشقانہ ہو جاتا ہے جس کو ہم منفی مزاج بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ اپنا کعبہ الگ بنانے کی فکر میں ہر وقت اپنی ڈیڑھ اینٹ کی مسجد الگ بناتے رہتے ہیں۔ مسجد تو نہیں بن پاتی ہاں ان کی درگت ضرور بن جاتی ہے۔ آپ کی خیریت اسی میں ہے کہ چاہے آگ سے کھیلئے یا کنوئیں میں چھلانگ لگائیے مگر ان عقلِ کل سے نہ الجھیے۔ ورنہ وقت برباد ہوگا اور روح ناشاد رہے گی۔

پانچویں قسم ہوتی ہے ان طلباء کی جو "خانہ نشین" کہلاتے ہیں۔ یہ بیچارے گھر سے گردن جھکا کر سیدھے یونی ورسٹی پڑھنے آتے ہیں۔ یہ بھولے بھالے کیا جانیں کہ یونی ورسٹی میں کیا ہوتا ہے، اور نہ اس کا غم کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے، نہ انھیں اس کی فکر کہ پہلے قیامت آئے گی کہ تیسری عالم گیر جنگ، درحقیقت یہ دردِ دل

کو دردِ جہاں کا درجہ دینے کے سخت مخالف ہوتے ہیں۔ یونی ورسٹی میں پڑھتے ہیں
پھر جھاٹ سے لائبریری میں گھس جاتے ہیں اور وہاں سے نوک دُم گھر کی طرف
بھاگتے ہیں۔ ان کو اس بات کا خوف رہتا ہے کہ اگر دیر ہوگئی تو کہیں امّی نہ ماریں
یا اگر راستے میں کسی نے چھیڑ دیا تو پھر کیا ہوگا، اپنی عزت اپنے ہاتھ ہوتی ہے گھر میں
گھستے ہی پھر پڑھنا لکھنا شروع کر دیتے ہیں۔ دوسرے دن پھر اسی طرح سے آتے
ہیں اور گھنٹہ ختم ہونے پر ایک کلاس سے دوسرے کلاس میں اس طرح بے تحاشا بھاگ
کر گھستے ہیں۔ گویا ان کو کوئی کلاس میں جانے سے روک رہا ہو۔ آپس میں جگہ کے لیے بھی
خوب خوب لڑتے ہیں۔ یہ کتاب کے کیڑے جب کتابوں کی دنیا سے باہر آتے ہیں تو
ان کی حالت قابلِ رحم ہوتی ہے۔ امتحان میں ان کی زیادہ تعداد فیل ہوجاتی ہو کیونکہ
آج کل جنرل پرچے زیادہ آتے ہیں جو ان کے بس سے باہر ہوتے ہیں۔ جب یہ ہنستے
ہیں تو پتہ چلتا ہے کہ رو رہے ہیں۔ یا روئیں گے تو معلوم ہوگا ہنس رہے ہیں۔ زور
سے بات کریں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ پھاڑ کھائیں گے۔ اگر آہستہ گفتگو کریں گے تو پتہ
چلے گا کچھ مانگ یا سونگھ رہے ہیں۔ عام طور پر یہ بہت تنگ نظر ہوتے ہیں۔ اور سوائے
پڑھائی لکھائی کے جس میں بالکل صفر ہوتے ہیں ہر چیز بہت حقارت کی نظر سے
دیکھتے ہیں۔ ان کے بارے میں یہ طے کرنا ذرا مشکل ہے کہ ان کی زندگی گھر سے شروع
ہوتی ہے یا یونیورسٹی سے۔ ویسے اگر ان کو یونی ورسٹی کی چلتی پھرتی تمیز کہا جائے
تو غالباً بے جا نہ ہوگا۔

چھٹی قسم ہوتی ہے اُن طلبہ کی جو خیر سے "کھلاڑی" ہوتے ہیں۔ اور اپنے
کھیل کے لیے مشہور بھی۔ یہ جوتا، پنجا اور سگریٹ سے کم بات نہیں کرتے۔ کرکیٹ بھی اتنا

ہی اچھا کھیلتے ہیں جتنی اچھی کومنٹری سنتے ہیں۔ یہ جتنے پھرتیلے ہوتے ہیں اسی قدر پڑھنے لکھنے میں بالکل صاف ہوتے ہیں ان کی زندگی مستقل ایک کھیل کا میدان ہوتی ہے جس میں یہ برابر رن بناتے رہتے ہیں۔ یہ کبھی کبھی کلاسوں میں بھی چلے جاتے ہیں مگر صرف میچ کا چیلنج دینے، کھلاڑی تلاش کرنے یا ٹورنامنٹ وغیرہ کے بارے میں طے کرنے۔ دن بھر نہایت شدت کے ساتھ شام کا انتظار کرتے ہیں، کھلاڑیوں کے اوپر تبصرہ کرتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ ٹیم بنا کر کھیلتے ہیں، لیکن اگر ٹیم نہ ملے تو اکیلے کھیلنے سے بھی نہیں چوکتے اخبار کا لاسٹ پیج (آخری صفحہ) بڑے شوق سے دیکھتے ہیں۔ باقی اخبار اگر ان کا بس چلے تو بند کر دا کے دم لیں۔ ورنہ اس کو بھی آخری صفحہ بنا کر چھوڑیں۔ جب یہ لوگ کھیل شروع کرتے ہیں تو اس وقت تک کھیلتے رہتے ہیں جب تک کہ کھیل ختم نہ ہو۔

ساتویں قسم ہوتی ہے اُن طلبا کی جن کے اوپر فلمی بھوت سوار رہتا ہے، یہ "فلم زدہ" کہلاتے ہیں اور فلمی مالیخولیا میں مبتلا رہتے ہیں۔ یہ باتیں کرنے میں تشبیہ اور استعارے کی جگہ فلم ایکٹریس کے نام، مقام ولدیت، سکونت وغیرہ سے کام لیتے ہیں۔ ان کو اس سے غرض نہیں کہ کلاس میں کیا پڑھایا جا رہا ہے مگر یہ آپ کو بتلا دیں گے کہ کون سی فلم میں کون کون کام کر رہا ہے، اور آخر کیوں؟ یہ آپ کو باسانی سمجھا دیں گے کہ گوپ اور گلوپ میں کیا بنیادی فرق ہیں جو ہم آپ میں نہیں ہیں، یہ فلمی پرچے پڑھتے اور فلمی معمے بھرتے ہیں اور دن دہاڑے ہالی وڈ کے خواب دیکھا کرتے ہیں۔ فلمی گانے ان کو اس طرح یاد ہوتے ہیں جس طرح ہمیں آپ کو قومی ترانہ یاد ہو۔ یہ ڈائلاگس میں بات کرتے اور پرچھائیوں میں چلتے ہیں۔ غرضکہ ہر وقت یا تو آرٹ کی دنیا میں رہتے ہیں ورنہ بمبئی بھاگ جاتے ہیں۔

طلبا کی آٹھویں قسم "ادیب" کہلاتی ہے اور شاعری یا افسانہ نگاری کے مرض یا تنقید کے خبط میں مبتلا رہتی ہے۔ یہ آپس میں کچھ اس طرح سے ملتے ہی لڑنا شروع کر دیتے ہیں کہ بس ایک دوسرے کو کھا ہی جائیں گے۔ مگر چونکہ ان کا غصہ سوڈے کے اُبال کے مانند ہوتا ہے اس لیے فوراً ہی ایسا گھل مل کر باتیں کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ بیچ بچاؤ کا ارادہ کرنے والا دل ہی دل میں خدا کا شکر بجا لاتا ہے کہ اچھا ہوا بیچ میں نہیں بولے ورنہ خواہ مخواہ شرمندگی اٹھانی پڑتی۔ یہ تو لڑ بھڑ کر پھر ایک ہو گئے۔ ادیب قسم کے طلبا پر ہر وقت یہ خوف طاری رہتا ہے کہ ادب پر جمود طاری ہے اور اس جمود کو خود اپنے اوپر اس طرح طاری کر لیتے ہیں کہ جیسے کوئی کھوسٹ بڑھیا کسی جوان کا صبر سمیٹ لے۔ ان کا ہاضمہ ہمیشہ بہت خراب رہتا ہے۔

"آج کل سارے ادیب تھک چکے ہیں۔ اب ان کے پاس کہنے کو کوئی بات نہیں رہ گئی ہے۔ ادب کو بچائیے سخت خطرے میں ہے۔ تم لوگ کچھ لکھو تو میری فِکر داری کچھ کم ہو۔" گویا ادب کے سارے چھپر کو آپ ہی کی ناچیز ہستی کا سہارا روکے ہوئے ہے۔ مگر یہ لوگ اب تبرک ہوتے جا رہے ہیں۔ دیکھئے اس تبرک سے کب محرومی نصیب ہو۔ کچھ حقیر فقیر قسم کے بگڑے دل ادیب خطوط کے جواب میں مدیران رسائل کو متاثر کرنے کے لیے اپنے نام کے بجائے اپنے فرضی سکریٹری کے دستخط کر دیتے ہیں۔ گویا خود اپنے ہی فرضی سکریٹری کی قائم مقامی کرتے ہیں۔ اور خطوط میں ظاہر کرتے ہیں کہ وہ یا تو علیل ہیں یا باہر گئے ہوئے ہیں۔ ورنہ بہت سخت مصروف ہیں۔ میں آپ کا پیغام ان تک پہونچانے کی کوشش کروں گا۔ آپ ان کو پڑھ سکتے ہیں ان سے بات نہیں کر سکتے۔ یہ ادب کی زبان میں ادیب کہلاتے ہیں۔ اور ہوتے بھی ہیں بالکل فری اسٹائل قسم کے۔ ویسے انھیں ملک و قوم کا

کا معمار کہا جاتا ہے۔ جی ہاں! جہاں ملک کا پڑا اکھڑا یا کوئی دیوار گری یہ اپنی کنی بسولی لے کر اس کی مرمت کے لیے پہونچ جاتے ہیں۔ ان کی کنی ان کا قلم ہوتا ہے اور بسولی کو گاشے کے طور پر استعمال کرتے ہیں۔ رہ گئی اینٹ کی بات تو ان کے پتھریلے الفاظ ہوتے کا کام دیتے ہیں۔ مثال کے طور پر مابعد الطبیعات، حفظ ماتقدم، سلسلۂ لامتناہی اور فلسفۂ اجتماع بالضدین اور اسی طرح کے پتھریلے الفاظ یکجا کر کے یہ ملک و قوم کی وہ شاندار تعمیر کرتے ہیں کہ تخریب کو پہچاننے میں آسانی ہو جاتی ہے۔

یہ آپ کو گیارہ بجے رات کے بعد گروہ کی شکل میں سڑکوں پر پھرتے نظر آئیں گے۔ پہلے یہ آپ سے بغل گیر ہو کر آپ کی جیبوں کا جغرافیہ معلوم کریں گے اس کے بعد آپ ان سے جیب یہ پوچھیے گا۔ "کیوں جناب آپ نے فلسفۂ طنز پر STREPTOMYCINE کی لکھی ہوئی نئی کتاب پڑھی ہے"؟ تو یہ آپ کو ناامید کرتے ہوئے جواب دیں گے" ویسے پڑھ تو ڈالی ہے۔ مگر کتاب میں سوائے حوالوں کے اور کچھ نہیں۔" لیکن خدا کے لیے آپ ان سے بھول کر یہ نہ کہہ دیجئے گا کہ "یہ کتاب اودھ میڈیکل اسٹورز سے مل سکتی ہے"! بہر حال یہ فوراً موضوع بدل کر ایک تھکی ہوئی انگڑائی لے کر کہیں گے "اچھا بھائی چلئے، ابھی ایک ادیب کے یہاں ڈنر کھانا ہے پھر جانا بار میں دور جام ہے اس کے بعد اگر بخشی کی دوکان کھلی رہی تو عظیم شاعر حجاز لکھنوی کے ساتھ ایک گروپ کھنچوانا ہے۔" یہ کہہ کر آپ سے رخصت ہو جائیں گے۔ اور پھر انھیں شہر کے کبڑیے مشک گنج کے تاڑی خانہ سے نکلتے ہوئے دیکھیں گے۔ اگر یہ کہیں باہر سے آئے ہیں تو اپنے کسی مخلص شاگرد جس کی عطاری کی دوکان ہو گی اس سے دس پانچ روپے ادھار لے کر پھر وہیں واپس لوٹ جائیں گے کہ جہاں سے آئے تھے۔

اور وہ لڑکے جو لڑکے نہیں لڑکیاں ہوتے ہیں اُن سے ملو! کہاں ملنا چاہتے ہو۔ یہ گھروں سے آکر کیلاش ہوسٹل میں رہنے لگتی ہیں جس کے بارے میں یہ ایک عام خیال ہے کہ یہ انہی کے لیے بنایا گیا ہے۔ اور جہاں شاید آپ کو یاد ہو کہ کچھ لڑکوں نے رات کے وقت "پشو پالن و بھاگ" کا بورڈ اس کے دفتر سے اکھاڑ کر جو اس سے ملا ہوا ہے ہوسٹل کے پھاٹک پر لگا دیا تھا اور جس پر ایک آفت مچ گئی تھی اور یار لوگوں کے نام ہو گئے تھے اور تب ہی سے اس ہاسٹل کو "پشو پالن و بھاگ" کا لقب دے دیا گیا ہے جہاں کہ یہ مخلوق پلتی بڑھتی ہے۔ یہ وہاں سے نکل کر کامن روم میں گھس جاتی ہیں جس کے بارے میں یہ ایک عام خیال ہو کہ اسکے اندر ان کی نشست و برخاست رہتی ہے اور جس چک کی آدمی سے زیادہ تیلیاں ان لوگوں نے خلال کر کر کے ختم کر دی ہیں اور اس طرح سے تاک جھانک کی ایک نئی راہ پیدا کر لی ہے۔ یہاں سے نکل کر آپ ان کو مختلف درجوں میں سب سے آگے بیٹھا ہوا پا سکتے ہیں۔ ان کو سب سے آگے کیوں بٹھلایا جاتا ہے اس کے بارے میں تجربہ کار پروفیسروں کا خیال ہے کہ کہیں یہ لوگ بھی کلاس کٹ نہ کرنے لگیں اس وجہ سے ان کو درجہ میں سب سے آگے بٹھا کر کڑی نظر رکھی جاتی ہے۔ کامن روم کے سامنے جو گھاس کے میدان ہیں اُن میں ان کے جھنڈ کے جھنڈ اڑتے پھیلتے دکھلائی پڑیں گے۔ اگر ان میں سے کوئی جوان کسی لڑکے سے بات چیت کرتی نظر آئے تو لوگ کہتے ہیں کہ دیکھو اس کو کہتے ہیں جوڑا عرف نوجوان جوڑا گر یہ سب فلرٹ کرنے والی باتیں ہیں ورنہ یہ سب تو چلتا ہی رہتا ہے۔ یہاں چونکہ تعلیم ساتھ ساتھ دی جاتی ہے اس وجہ سے لڑکیاں لڑکوں سے الگ رہتی ہیں۔

مجھ سے اک چائے کی پیالی نے کہا

کیا بتاؤں آپ بھی سن کر بور ہو جائیں گے، میں ان بے فکروں کے لیکچر سے سخت عاجز ہوں، خصوصاً یہ شاعر تو مجھے سب سے زیادہ بور کرتے ہیں۔ آتے ہی مجھے بلا لیں گے۔ دن بھر اپنے سامنے بٹھلائے رہیں گے۔ وہ تو کہیئے رات کو اکثر یہ شاعروں میں چلے جاتے ہیں ورنہ ان سے تو رات کو بھی چھٹکارا ممکن نہیں، حالت ان کی یہ ہے کہ لوگوں کا راستہ چلنا دشوار کر دیتے ہیں، پکڑ پکڑ کر زبردستی اپنی غزلیں سنانے کے لیے جانے بلاتے ہیں، اگر تعریف نہ کرو تو پھر سنانے کی دھمکی دیتے ہیں۔ اسی خوف سے لوگ عام طور پر ان کی الٹی سیدھی غزلوں کی تعریف بلا سنے ہی کر دیتے ہیں جہاں آپ نے ان کی تعریف شروع کی اور یہ جھک جھک کر سلام کرنا شروع کر دیں گے ہاتھ جوڑ کر کھڑے ہو جائیں گے، ان کے منھ کو لگام ہی نہیں ہوتی، یا تو غزلیں سنائیں

گے ورنہ نئی غزل تیار ہونے لگے گی۔ عام طور پر یہ دن بھر میں ایک دیوان تیار کر لیتے ہیں۔ بھلے آدمی بیچارے ان کو دیکھ کر کترا جاتے ہیں۔ ابھی دن کا تو قصہ ہے، ایک شاعر صاحب کسی تانگے والے کو پکڑ لائے اور شروع کر دی غزل سنانا۔ بمشکل آدھی غزل سنا پائے ہوں گے کہ وہ غریب اپنی جان چھڑا کر بھاگا۔ شاعر صاحب نے لپک کر ہوٹل کے بیرے کو پکڑا۔ "نہیں واللہ تھوڑی سی رہ گئی ہے، آپ کو ہماری جان کی قسم ضرور سنئے۔" مگر اس کو فرصت کہاں۔ اگر یار لوگ بچا نہ لیتے تو معلوم نہیں اس غریب کا کیا حشر ہوتا۔ کچھ شاعروں کو مالک ہوٹل نے بہت سر چڑھا رکھا ہے۔ جب ہوٹل میں بیٹھنے کی جگہ نہیں رہتی اور اندیشہ ہوتا ہے کہ آنے والے گاہک لوٹ نہ جائیں تب وہ ان کو اشارہ کر دیتا ہے ادھر انھوں نے ترنم سے اپنا تازہ باسی کلام پیش کرنا شروع کیا ادھر لوگ اس ملے جلے پروگرام سے جان بچانے کے لیے بھاگے۔ ان شاعروں کے بارے میں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ یہ اپنی جیبوں میں بٹیریں پالتے ہیں مگر اصلیت میں وہ بٹیریں نہیں ہوتیں بلکہ ان کے دیوان ہوتے ہیں جو شاعروں کے ہاتھ سے زبان تک آنے اور لوگوں پر چھا جانے کے لیے جیب میں پھڑ پھڑاتے رہتے ہیں۔ میں نے اصلی شاعر کو دیکھا ہے۔ سر جھاڑ، منہ پہاڑ، چلیے تک کی خبر نہیں ہوتی اور ساری دین و دنیا اُن کے کلام تک محدود ہوتی ہے۔ مگر خود ان کا کلام لامحدود ہوتا ہے۔ جب ہوٹل میں سناٹا ہو جاتا ہے تب یہ نہایت حسرت کے ساتھ اپنا کلام زانو پر تہہ کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس کو یہ زانوئے ادب بتلاتے ہیں۔ اس وقت دراصل یہ حساب لگاتے ہیں کہ آج کے کلام پر کس قدر لاگت آئی۔ کس قدر چائے، بیڑیاں پان اور سگریٹ وغیرہ خرچ میں آئے۔ جن کے اخراجات زیادہ بڑھ جاتے ہیں وہ

آسانی کے لیے خود بیڑیاں بنانے لگتے ہیں۔ کیونکہ ان کا دل اپنی بنائی ہوئی بیڑیوں کو بلا
بلا کر اپنا کلام سنانے میں زیادہ لگتا ہے۔ پھر کفایت بھی رہتی ہے۔ ہوٹل کے اندر ہر وقت
اُلّو بولتا رہتا ہے لیکن جب شاعر آکر شروع ہوتا ہے تب وہ بے بس ہو جاتا ہے۔
اگر آپ شاعر سے بات کرنا چاہیں تو وہ آپ کو اشارے سے منع کر دے گا "خاموش
شعر نازل ہو رہا ہے"۔ آنے والے شاعر کے بارے میں یہ نہیں بتلایا جا سکتا ہے کہ وہ بوڑھا ہے
یا جوان۔ کیونکہ بوڑھے شاعر منہ زور ہونے کے سبب سے جوان اور خیالات کے اعتبار سے
بوڑھے ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں ناپ تول کر بھی نہیں بتایا جا سکتا کیونکہ ان کے
ہاتھ کا کلام جیب کے کلام سے بھاری اور منہ کے کلام سے مختلف ہوتا ہے۔ جب شاعر
بات کرتا ہے تب یہ تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ کچھ کہہ رہا ہے مگر یہ نہیں معلوم ہوتا کہ وہ کیا
کہہ رہا ہے۔ شاعر کے انداز بیان میں اس کا کلام کم اور تخلص زیادہ ہوتا ہے۔ کامیاب
شاعر وہ ہوتا ہے جو صرف اپنا تخلص سنائے اور کلام کو صاف ٹال جائے۔ اچھے
شاعر وہ ہوتے ہیں جو واقعی شاعری کرتے ہیں یعنی ہوٹل نہیں آتے۔ ایک اوریج شاعر کی بابیات
(واہی سے بن کر بگڑا ہے)، مریخ کو کوسنا، فرشتوں کو بے نقط سنانا، بلبل کو باغ کا پتہ بتانا،
مرغے کو برا بھلا کہنا، چکورہ کو چاند تک پہونچانا، آسمان کو اس کے بڑھاپے کا احساس
دلانا، عاشق کو معشوق کی جوتیاں کھلوانا، مشاعرہ کے لیے غزل تیار کرنا اور شراب یا نز
کمپنیوں کی پبلسٹی کرنا ہوتا ہے اسکے علاوہ مر کے جی اٹھنا انکے بائیں ہاتھ کا کھیل ہوتا ہے
یہ عشق کے معاملے میں بالکل آزاد ہوتے ہیں جب، چاہیں عاشق ہو جائیں، ان کا کوئی
کچھ نہیں بگاڑ سکتا، کیونکہ شاعر کے لیے عشق کرنا اتنا ہی ضروری ہوتا ہے جتنا کہ شاعری
کرنا۔ ایک شاعر وہ ہوتا ہو جو مجھے لب پہ لگاتے ہی ٹھنڈی سانسیں بھر کے

کہتا ہے: "کاش تم سرخ ہوتیں" نہ معلوم ان کو لال رنگ کی کہاں سے اتنی پہچان ہو گئی ہو۔ آتے ہی سرخ سرخ بگولے اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ سرخ انقلاب لانا، سرخ آنچل میں معشوق کی طرح لال لال آنکھیں بنانا، غرض آتے ہی اپنے کرتب دکھلانا شروع کر دیتے ہیں۔ مجھے تو یہ کشمیری چائے کے ایجنٹ معلوم ہوتے ہیں۔ چائے کم پیتے ہیں اور انقلاب کے نعرے زیادہ لگاتے ہیں اور محبوب کو دھمکی دیتے ہیں کہ اگر تم نے مجھ سے شادی نہ کی تو انقلاب کر دوں گا، نئے قسم کے شاعر ہیں جو اپنے کو آزاد شاعر بتاتے ہیں مجھ کو پل بھر بھی چین نہیں لینے دیتے۔ کبھی مجھ کو لبوں سے لگائیں گے کبھی تشتری میں رکھ دیں گے پھر تشتری سے اٹھا کر میز پر رکھ دیں گے؛ پورے وقت آزاد شاعری کرتے رہتے ہیں۔ بار بار مجھے سنانے کو سماج، نفسیاتی کش مکش، ردعمل، لاشعور، لینڈر، جوئبار، پنگھٹ، پڑوسی کا مرغا اور پڑوسن کی بکری وغیرہ معلوم نہیں کیا کیا اڑاتے رہتے ہیں ان کی ہر بات بے تکی اور ہر جملہ نا تمام ہوتا ہے اور وہی ان کا کلام ہوتا ہے، پرانے قسم کے شاعر زمانے کو کم اور مرغے کو زیادہ کوستے ہیں۔ بیٹھے بیٹھے نئی زمین تیار کرنا شروع کر دیں گے پھر اس پر گرہ لگانا شروع کر دیں گے۔ ان کو فاعلاۃ فاعلات کی تقطیع منہ زبانی یاد ہوتی ہے۔

لیجئے آپ بور ہو گئے سنتے سنتے، یہ افسانہ نگار کوئی کم پریشان کرتے ہیں۔ خدا معلوم یہ ادب کی تخلیق کس وقت کرتے ہیں۔ ہر وقت تو مجھے منہ سے لگائے ہوٹل میں ڈٹے رہتے ہیں۔ شاعر بے چارہ تو صرف گا گا کر ہی بور کرتا ہے مگر یہ تو چلا چلا کر بور کرتے ہیں۔ ہوٹل کے کھلوانے، بھٹی سلگوانے اور ہوٹل بند کروانے میں ان کا بڑا ہاتھ ہوتا ہے۔ یہ چائے ادھار زیادہ پیتے ہیں اور چندہ کر کے کم، جب یہ اتفاق سے کسی کو افسانہ

سننے پر رضامند کر لیتے ہیں جو عام طور پر شکل ہوتا ہے تو اس کا یقین دلاتے ہیں کہ افسانہ پہلے افسانے سے اچھا ہے ان کے کان میں پنسل اور بغل میں افسانوں کا پلندہ دبا رہتا ہے جب یہ سنانا شروع کرتے ہیں تو لوگ اس دھوکے میں جمع ہو جاتے ہیں کہ کوئی تیر بہدف اشتہاری دوا فروخت ہو رہی ہے۔ افسانہ جب اپنے کلائمکس پر پہونچتا ہے تو سوائے افسانہ نگار کے سب وہاں سے رخصت ہو چکے ہوتے ہیں، ورنہ احتیاطاً سونا شروع کر دیتے ہیں جب یہ آپس میں بات کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ افسانہ سنا رہے ہیں۔ جیب میں اگر رومال تلاش کریں گے تو ظاہر ہوگا کہ پلاٹ تیار کر رہے ہیں۔ جس میں سسپنس پیدا کرنے کے لیے ایکشن سے کام لیتے ہیں۔ رومال کے ملتے ہی جو عام طور پر کسی دوسرے سے مانگ لیتے ہیں۔ اُسے مانگنے میں ڈائیلاگس سے کام لیتے ہیں جس کا اختتام ٹریجڈی یا کامیڈی پر ہوتا ہے ادبیات کا جواب اینٹ یا پتھر سے دیتے ہیں جسے افسانوی زبان میں کلائمکس سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ جب ملتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ افسانے کا ہیرو افیم کھائے اونگھ رہا ہے، ان کی باتوں سے پتہ چلتا ہے کہ یہ دوپہر کو سوتے، رات بھر افسانہ لکھتے اور اس کو صبح شام سناتے ہیں۔ کیونکہ ان کو لوگوں کی کمزوری معلوم ہے کہ وہ صبح شام ہوٹل میں آتے ہیں۔ آتے ہی یہ بتانا شروع کر دیتے ہیں کہ آج میں افسانے کی تلاش میں کانجی ہاؤس مدک خانے، جنگل بیابان، قبرستان، اور میونسپلٹی کے گندے نالے تک مارا مارا پھرتا رہا، ان کی زیادہ تعداد سماج کی تلاش میں نکلتی ہے، یہ سماج کو دیکھتے ہی پنسل کاغذ نکال لیتے ہیں، عموماً سماج ان کو دیکھتے ہی بھاگ کھڑا ہوتا ہے، میرے پاس تو بھانت بھانت کے افسانہ نگار آتے ہیں، کچھ تو آتے ہی بجائے لب کے مجھ سے ڈاڑھی بنانا شروع کر دیتے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ ایسا وہ ٹنکر گھملنے کے لیے کرتے ہوں، یہ آتے ہی لوگوں کو دہلا دیتے ہیں۔

ہوشیار رہو، جاگتے رہنا، پھر نہ کہنا ہمیں خبر نہ ہوئی، مذہب خطرے میں ہے، ان میں اور ترقی
پسندوں میں بڑی نوک جھونک رہتی ہے۔ یہ ترقی پسند ہر وقت گورنمنٹ پر نظریں کڑی رکھتے
ہیں۔ ان کے افسانوں میں لال مرچوں کی دھانس، شرک کے گڈھے، فاقے کی موت اور
فلک شگاف نعروں کی گونج ضرور رسی ہوتی ہے۔ ان کے علاوہ شرمہ مستی والے بھی تو یہاں
بکثرت آتے ہیں جو ہر وقت اپنے افسانوں میں محبوب کا اسکینڈل کرواتے پھرتے ہیں۔
ان میں سے بہت سے تو اب تک غدر سے متاثر نظر آتے اور بقیہ فاقوں سے۔ یہ دل کی
بات زبان تک لاتے ڈرتے ہیں کیونکہ زمانہ جو اتنا خراب آ گیا ہے، ان قلم زدوں ہی کو لے
لیجئے میں تو ان سے عاجز ہوں، ہوٹل میں اس طرح آتے ہیں جیسے وہ کسی سنیما یا اسٹوڈیو میں
داخل ہو رہے ہوں۔ مجھے پاتے ہی اپنے ڈائیلاگس سنانے شروع کر دیں گے۔ جب چپ
ہوں گے تو ایسا معلوم ہوگا کہ فلم کی شوٹنگ روک دی گئی یا کوئی شاٹ کٹ کر دی گئی ہو۔
غرض آتے ہی نخرے شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لباس سے مرد کم اور عورت زیادہ معلوم ہوتے
ہیں۔ یہ اپنے پھول دار اور طرح طرح کے تراش خراش والے لباس کو اس طرح پہنتے ہیں جیسے
کہیں سے جمپر یا بلاؤز لے بھاگے ہیں۔ بات کریں گے تو پتہ چلے گا کہ پوز بنا رہے ہیں۔ آتے ہی
اخبار کا تیسرا ورق کھول کر گنگنانا شروع کر دیں گے "ہم تو تیرے دل کے بنگلے میں آنا مانگتا"
بیرا جب ان سے چائے کے پیسے مانگے گا تو برہم ہو کر جواب دیں گے۔ "بیرا بل ابھی سو رہا ہے، شور و غل
نہ مچا۔ جب مالک ہوٹل ان کو ادھار دینے سے معذوری ظاہر کرے گا تب یہ "غم کی دنیا سے
دل بھر گیا لے مجھے دل کہیں اور چل" الاپتے ہوئے ایک نظر حسرت ان خوش حال گاہکوں
پر ڈالیں گے جو اس وقت مٹن چاپ اور سینڈوچیز وغیرہ کھاتے ہوں گے، اور کہیں گے
"جہاں بجتی ہے شہنائی وہاں ماتم بھی ہوتے ہیں۔" آتے ہی یہ اشوک کمار کی طرح ایک

ایک خاص فلمی ڈھنگ سے کش لے کر بیڑی کا دھواں چھوڑتے ہیں۔ وہ دھواں اُن کے کریم سے لپے پُتے چکنے ہوئے بدنما چہرے جس پر نقشِ مراد آبادی کام بھی بنا ہوتا ہے، کو چھپانے کی ناکام کوشش کرتا ہے۔ اس وقت یہ بالکل پاپنگ شو کا "موٹو" یا ٹنکر کا کارٹون معلوم ہوتے ہیں۔ آتے ہی نرگسی کوفتے اور شامی کباب کی فرمائش کریں گے۔ ان کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مالک ہوٹل اپنا باسی مال ان کو فلم سٹارز کے نام پر کھلا دیتا ہے۔ یہ مرا اس بات کو مان لیتے ہیں جو اتفاق سے بڑے والے صاحب مرنے سے تھوڑی دیر پہلے کہہ گئے تھے۔ جب یہ دیکھیں گے کہ چائے آ رہی ہے تو گنگنانا شروع کر دیں گے۔" دھیرے دھیرے آ رے بادل دھیرے دھیرے آ"۔ ان کے ہوٹل سے اٹھنے کا سین نہایت رقت آمیز ہوتا ہے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ کسی لڑائی کے فلم کا سین چل رہا ہے۔ یا تو یہ کسی سنیما ہال میں گھس جائیں گے ورنہ پھر ہوٹل میں واپس چلے آتے ہیں۔ ع

دہی میں ہوں وہی یہ سر پھرے ہیں

جناب میں اپنی بپتا کہاں تک سناؤں۔ ان آنے والوں میں سب سے خطرناک قسم ان لوگوں کی ہوتی ہے جن کے آتے ہی مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چاروں طرف ان کے باپ دادا اور راجا مہاراجاؤں کی روحیں لپٹی ہوئی ہیں۔ خالتو لوگ ان کو دیکھتے ہی گھیر لیتے ہیں۔ باقی لوگ ان سے اخلاقاً کتراجاتے ہیں۔ مجھے منہ سے لگتے ہی بس یہ شروع ہو جائیں گے۔"اجی کھیم گنج کے سید چچا کو کون نہیں جانتا، مرحوم اتنا اچھا جعل کرتے تھے، بھئی واہ واہ، سبحان اللہ، اور دستخط تو سبحان اللہ، کیا مجال جو کبھی چوک ہو جائے۔ شیرنگ صاحب کا زمانہ تھا، انھوں نے گھسیٹے کو پھانسی کی سزا دی گھسیٹے پھانسی کے لیے بھیج دیئے گئے۔ چچا سے گھسیٹے کی ماں اور بیوی کا رونا نہ دیکھا گیا۔

انھوں نے بڑی عدالت میں جاکر وہ الٹی سیدھی کہی کہ بساط الٹ کے رکھ دی، یہی کیا. گواہی کے لیے وہ باتوتی اشخاص پیش کیے کہ سرکاری وکیل سر پیٹ کے رہ گیا. یہ سب بچپلے کے دم کی تو برکت تھی. حکم فرنگی کا ہوتا تھا فریق اول پر اور فرنگی چلی آ رہی ہے فریق ثانی کے یہاں، مرزا تمھارے ولی میاں کے دادا کو ہوئی اور کھگبتی کلو کے نام نے خدا بخشے ولی میاں کے دادا کو، مونچھوں پہ تاؤ دے کر گھوما کرتے تھے تاؤ. تم لوگوں نے وہ زمانے کہاں دیکھے جب چچی سر سے پیر تک سات رقم کا زیور پہنتیں. کانوں میں جو جڑاؤ گوشوارے پہنتی تھیں اُن میں صرف لاکھ لاکھ روپوں کے تو لعل جڑے ہوئے تھے ابا جان جب صبح بگھی پر ہوا خوری کرنے نکلتے تھے تو ننگی تلواریں لیے چار سوار آگے اور چار پیچھے چلتے تھے. لوگ جھک جھک کر سلام کرتے تھے" ——— اتنے میں کسی بے فکرے نے فقرہ کس دیا۔ "اجی مرزا جی ایک بیڑی ہوگی آپ کے پاس" اور مرزا جی اس پر برس پڑیں گے۔ "چل بے بدتمیز بڑوں سے بیڑی مانگتا ہے. بڑی رو ٹیاں لگ گئی ہیں۔ اچھا نکال، ہے تیرے پاس کوئی بیڑی" ——— جس وقت یہ نھتو کو جوان کے خطرناک ارادے سے کر غدر کے واقعات، اصلی گھی، خالص دودھ اور سرخ افیوں کے چورے کا لال مرچ اور پپیتے کے بیجوں کا کالی مرچ سے موازنہ کرتے ہوں گے تو ان کے پیر کی انگلیاں جوتے میں سے جھانکتی نظر آئیں گی۔ نیا چوروں سے بیزاری کا اظہار یوں کریں گے کہ کل جب وضو کر کے نماز پڑھنے کھڑا ہوا تو ابا جان کے وقتوں کا بیس سیر کا خالص چاندی کا لوٹا کسی نیا چور نے پار کر دیا. یہ بے چارے دنیا کے تمام آرام و آسائش سے پرہیز کرتے ہیں. حتیٰ کہ کپڑوں وغیرہ سے بھی ایک حد تک بے نیاز ہوتے ہیں. ان کا خیال ہے کہ دنیا کی ہر چیز پر ان کے باپ دادے اور دوسرے بزرگوں کا حق ہے. بس

بزرگی کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ مرحوم ہونا چاہیے۔ کیونکہ زندہ بزرگ مرحوم بزرگ سے کم بزرگ ہوتا ہے۔ چونکہ یہ پیٹ کے ہلکے ہوتے ہیں اور زمانۂ حال کو ہمیشہ ماضی کی طرف لے جانے کی کوشش کرتے ہیں، لہٰذا اسی کوشش میں، اکثر بلا چائے کے پیسے دیئے غائب ہو جاتے ہیں۔ پکڑے جانے کی صورت میں اُدھار کر دیتے ہیں۔ مگر میری جان تو عذاب سے چھوٹ جاتی ہے

میرے پاس آنے والی مخلوق کی ایک اور تکلیف دہ قسم بھی ہوتی ہے۔ ان کے لیے کوئی قید نہیں کہ وہ پڑھے لکھے ہوں یا کوئی خاص پیشہ کرتے ہوں، ان کے ہوٹل میں داخل ہوتے ہی ان کی بات چیت اور چال ڈھال سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ یا تو بیٹنگ کر رہے ہیں ورنہ رنز بنا رہے ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ سینچری بنانے کی فکر میں ہوں۔ بات سننے کا انداز بتاتا ہے کہ کمنٹری سن رہے ہیں یا سنا رہے ہیں۔ جب بیرا ان کو پیسے واپس کرے گا تو یہ ان کو لینے کے بجائے کیچ کریں گے۔ جب یہ چائے پی چکیں گے تو کہیں گے کہ یار ہم تو آؤٹ ہو گئے۔ لیکن اگر آپ ان سے L.B.W کا مطلب پوچھ بیٹھیں تو فوراً یہ آپ کو منہ چڑا دیں گے۔ ایک دوسرے سے چائے پینے کے لیے اس قدر بیتاب نظر آتے ہیں کہ ایک دوسرے کو بکتے ہی چلانے لگتے ہیں "کیچ کیچ" ان میں پھر فوراً کوئی امپائر بن جاتا ہے ہو جائے کا مسئلہ پیش ہوتے ہی ٹاس کرتا ہے کہ چائے کا بل ہم ادا کریں گے یا تم۔ لیکن اگر ٹاس نہ ہو اور سکہ کھڑا ہو جائے تب یہ اُدھار چائے کا فیصلہ کر لیتے ہیں۔ چائے اگر بہت اچھی لگے تو یہ ونس مور چلانا شروع کر دیں گے اور اسی بہانے چائے کا دوسرا دور شروع کر دیں گے۔ ان کی زندگی مستقل کرکٹ میچ ہوتی ہو۔ اور عموماً چائے کے پیسے دیئے بغیر آؤٹ ہو جاتے ہیں۔ بے چارا ہوٹل والا ان کے

پیچھے" نو بال، نو بال" چلا کر بھاگتا ہے، مگر یہ رنز بناتے ہوئے غائب ہو جاتے ہیں اور
ہوٹل والے کی بالنگ ان کی بیٹنگ کے آگے بے کار ہو جاتی ہے۔ اور اس بھاگ دوڑ
میں وہ اپنی سیکنڈ اننگ ڈکلیئر کرنے میں کامیاب ہو جاتے ہیں۔

مگر صاحب مجھ کو سکون اس پر بھی کہاں ملتا ہے۔ یہ ریس والے جن سے میں بہت
زیادہ بدہو جاتی ہوں ان چھوٹی چھوٹی باتوں کو ہمیشہ ناپسند کرتے ہیں۔ کرکٹ کے
کھلاڑی کے چمپت ہوتے ہی یہ میرے کانوں پہ چلانا شروع کر دیتے ہیں دیکھو دیکھو
بلیک کوئن دن اور یہ، ان، اد یسیں ہو رہی ہے۔ یہ ریس والے آتے ہی مجھے کیوں
بلا لیتے ہیں۔ ورنہ میں تو دیکھتی ہوں کہ ان کے ہاتھ میں طوطا ریس کا نڈ ہوتا ہے اور
دل میں یہ برابر شرط لگاتے رہتے ہیں۔ ان کا دماغ کسی نہ کسی ریس کورس کی کھائی پھاندتا
رہتا ہے۔ بس یہ آتے ہی "کم اپ جاکی، کم اپ جاکی" چلانا شروع کر دیتے ہیں۔
اور بے خیالی کے عالم میں تشتری ان کے ہاتھ سے گر کر اگر ٹوٹ بھی جائے تب
بھی اس کے دام یہ کبھی ادا نہیں کریں گے۔ ان کا کہنا ہے کہ "فرض کر دیہ تشتری اگر مالک
ہوٹل کے ہاتھ سے گر کر اگر ٹوٹ جاتی تو کیا ہوتا؟" یہ ہر وقت اپنی آنکھوں پہ دوربین
چڑھائے نہایت بے قراری کے ساتھ بدھ اور ہفتہ کا انتظار کرتے رہتے ہیں۔ ان کے
حساب سے ہفتہ دو دن کا ہوتا ہے۔ اگر آپ اصرار کریں تو باقی دن یہ رات میں جوڑ دیں
گے ورنہ مہینوں اور سال میں شمار کر دیں گے۔ یہ اپنے بات کے دھنی ہوتے ہیں
اور ریس کے اڑیل ٹٹو کی طرح ہر بات پہ اڑ جاتے ہیں۔ ان کی باتوں سے ایسا معلوم
ہوتا ہے کہ آج کی ریس کا آنکھوں دیکھا حال ریڈیو سے براڈ کاسٹ کیا جا رہا ہے۔
یہ آتے ہی بے پر کی اڑانا شروع کر دیتے ہیں۔ آج کل بینسلنگ والے بہت بے ایمان

ہو گئے ہیں۔ بکی لوگ غلط بھاؤ کھول دیتے ہیں، جاکی گھوڑے کو بچکا دیتے ہیں میں تو کہتا ہوں کہ اگر مدھوبالا کی لگام نہ کھینچ لی جاتی تو بھلا دلیپ کمار جیت سکتا تھا، ریس والوں کے تو اب بڑی رو ٹیاں لگ گئی ہیں۔ صدر طیٹ کے گھوڑے کا آخر یونی ٹپیٹ میں کھنے کا کیا تک تھا۔ یوں ہی تو مل جل کر رقمیں بنائی جاتی ہیں ورنہ تو منٹ میں ڈاؤ اور بڑے کے یوں بھاؤ نہ گر جائے، اچھا ناگی گنج والی ریس کا کیا ہوا، آ گیا نہ مغل امپائر ون۔ میں تو پہلے ہی کہتا تھا نہ کہ اس پہ دو کے تین یا پانچ کے سات لگا دو۔ اگر دو دو آنے بھی بیٹے تو تم سات روپے جیت پر رہتے "۔ اس کے بعد گھوڑوں کے نام، وزن، بھاؤ، خوراک، پچھلا ریکارڈ اور اس پر چڑھنے والے جاکی کے حسب و نسب پر بات شروع ہو جائے گی جو اگلی ریس تک جاری رہے گی۔

مجھ کو بے لاگ بور کرنے والوں میں اخبار نویس بھی کسی سے پیچھے نہیں رہتے۔ یہ دنیا کا حال بتلاتے ہوئے ہوٹل میں داخل ہوتے ہیں۔ ان کے دل میں کشمیر کا مسئلہ، دماغ میں کوریا کی لڑائی، زبان پہ پاک امریکن ملٹری پیکٹ، ہونٹوں میں سگریٹ، ہاتھ میں چائے کی پیالی ہوتی ہے۔ یہ ہمیشہ سچ کو سچ بنانے کی فکر میں دبلے اور جھوٹ کو جھوٹ بنانے کے غم میں بیمار رہتے ہیں۔ ان کو یہ نہیں معلوم کہ آج گھر میں چنے ختم ہو گئے، مگر یہ فوراً بتلا دیں گے کہ ماسٹر تارا سنگھ پنڈت نہرو کے کان میں کیا کہنے والے ہیں، مہتروں کی ہڑتال کا اثر ویسٹ اینڈ ٹیلی گراف کے محکمے پہ کیا پڑے گا، بڑے لوگ آج کل کیا کر رہے ہیں۔ جرائم کی رفتار صوبے میں کم، پولیس تھانوں میں اس سے کم، اور اخباروں میں سب سے زیادہ ہو رہی ہے۔ ہائے خبروں کو آج کل کیا ہو گیا ہو۔ نہ کہیں لڑائی ہے نہ دنگا فساد، بڑے بڑے لیڈروں نے تو جیسے آج کل اپنے منھ سی

دیکھے ہیں۔ عوام اور سماج دکھلائی نہیں پڑتے۔ خبریں بناتے بناتے ناک میں دم ہو۔
لوگ آج کل ہمارے اخبار میں بہت کم دلچسپی لے رہے ہیں۔ جب مالک ہوٹل کو ان سے
ہوٹل خالی کروانا ہوتا ہے تو وہ اگر ان سے دریافت کرے گا۔ "ارے بھئی اخبار نویسو!
آخر تم کو کچھ بسنت کی بھی خبر ہے۔ ابھی ابھی کچھ دیکھا"۔ پھر وہ اُن کے کان میں کہے گا
"ابھی ابھی ادھر سے دو تین لیڈر بغل میں کچھ بیانات دبائے جا رہے تھے۔ غالباً
ہوائی اڈے کی طرف گئے ہیں"۔ پھر یہ سب اچھل کر "اکس کلوزیو انٹرویو اور خصوصی
بیانات کا نعرہ بلند کرتے ہوئے فوراً" ہوٹل سے غائب ہو جاتے ہیں۔

مگر اس سے کیا ہوتا ہے صاحب۔ پھر یہ افیونی اگر بے پر کی اڑانا شروع کر دیتے
ہیں۔ افیونی اخبار نویس کو بالکل منھ نہیں لگاتا۔ اس میں قوم پرستی کا جذبہ بشدت سے
ہوتا ہے۔ اس وجہ سے افیونی ہمیشہ افیونی کا ذکر کرتا رہتا ہے۔ افیونی کا حلیہ بالکل
ایسا ہوتا ہے جیسا کہ خود افیونی۔ اس کے سر پر بال مانند ایک گنج کے ہوتے ہیں جس
میں چڑیاں باقاعدہ گھونسلے بنا سکتی ہیں، مگر ان میں چڑیاں نام کو نہیں رہتیں، بلکہ
کھٹمل، جوئیں، پسو اور دوسری حشرات الجسم کا مستقل قیام۔ افیونی بہت مہمان نواز ہوتا
ہے اور اپنے مہمانوں کا بہت خیال رکھتا ہے۔ آنکھیں اندر کو دھنسی ہوئی یا برائے
نام ہوتی ہیں۔ جن کے چاروں طرف نہایت تاریک گڑھے اور حلقے پڑے رہتے ہیں۔
جو چہرے کی جھریوں سے ہر مقام پر آ کر ملتے ہیں۔ اور جھریوں کے لٹکنے سے افیونی کا
تانبا جیسا چہرہ طباق کی طرح صاف اور بھاڑ کی طرح کھلا ہوتا ہے۔ اس کی کھنچی
ہوئی گردن، جھکی ہوئی کمر کا ساتھ دیتی ہے۔ اس کا قد اس لاٹھی کے برابر ہوتا ہے
جس کو وہ ٹیک کر چلتا ہے۔ اگر کہیں اتفاق سے قد نکلنے لگے تو وہ اپنی کمر کو خم

دے کر لاٹھی کے برابر کر لیتا ہے۔ یہ جوتی برائے نام پہنتا ہے بس اس طرح کہ نہ صرف پیر
آزاد رہیں بلکہ زمین سے بھی جلب منفعت ہوتا رہے۔ اس کے ایک ہاتھ میں لاٹھی ہوتی ہے
دوسرے میں افیون کی گولیاں۔ ادھر اس نے مجھے منھ لگایا اور ادھر اس پر پینک سوار ہوئی
مگر خود یہ کرسی پر سوار ہو جاتا ہے اور پینک میں جھوم جھوم کر کہنا شروع کرتا ہے۔

" اماں کیا کشمیر چلاتے ہیں۔ خدا بخشے ماموں جان کی ڈیوڑھی پڑا پڑا
چلمیں بھرا کرتا تھا۔ اب چار روز سے لیڈر کیا ہو گیا ہے، بس منھ نہ کھلواؤ، تم لوگوں نے
تو اس کو آسمان پر چڑھا رکھا ہے اور یہ مُردہ کر دیا، ارے بھائی اس کو تو بڑے نواب
صاحب جنت مکانی رکھے ہوئے تھے، ارے قربان جاؤں، اہاہا کیا مجرا کیا کرتا تھا۔
یہی ہاتھ ہیں جنھوں نے ہزار ہزار کے توڑے اس کو یوں ہی اٹھا کر دے دیے تھے۔ اس کی
آنکھوں میں غضب کا شباب تھا۔ چھبن بائی تو مرتی تھی اس کی آنکھوں پر۔ پھر جب
کوریا شام کو سج بن کر چھبن بائی کے ساتھ چابک سے مونچھوں پر تاؤ دیتا ہوا گلے میں
ہار پھول ڈال کر نکلتا تھا تو میرے لیے خیراتی کے یہاں سے ایک پڑیا افیم اور ایک دونا
قلاقند لیا کرتا تھا۔ تم لوگ کیا جانو یہ کوریا تو میری گودوں کا کھلایا ہوا ہے۔ جوانی
میں نواب چھتری قدر سے اس کی ماں کی آنکھ لڑ گئی تھی۔ انھوں نے اس کو اپنے گھر
ڈال لیا تھا۔ کوریا تانبے والی گلی میں تو رہا ہی کرتا تھا۔ جب یہ پینک کے زور میں بجائے
کرسی کے زمین پر آرام کرنا شروع کر دیتے ہیں تو مالک ہوٹل انھیں گود میں اٹھا ان کی
گھر والی کے سپرد کرتا ہے اور وعدہ لے لیتا ہے کہ مرزا صاحب کو کل ضرور چراغ جلے
افیم کھلا کر بھیج دینا۔

افیم چی کے جاتے ہی مقامی سیاسی لیڈر مجھے بور کرنا شروع کر دیتے ہیں۔ یہ لوگ

افیونی سے کسی حالت میں کم نہیں ہوتے۔ چونکہ اخبار نویس ان کو منہ نہیں لگاتے اس لیے یہ ہمیشہ اخبار نویسوں سے خفا رہتے ہیں۔ اور اپنے بیانات مجھے یار دی کی ٹوکری کو اس طرح دیتے ہیں کہ عوام یا سماج کو کانوں کان خبر نہ ہو، یہ جانتے ہیں کہ سماج کو اگر پتہ چل گیا تو سر کے بال گننے میں آسانی ہو جائے گی اور یہ بات شاید ان کو پسند نہیں۔ ان کی لیڈری چائے خانے میں پرورش پاتی ہے۔ یہ ہوٹل سے رخصت ہوتے وقت تمام سیاسی مسائل کو اٹھا کر طاق پر رکھ جاتے ہیں۔ آتے ہی ان پر بڑے بڑے مسائل طاری ہو جاتے ہیں۔ یہ ہمیشہ بڑے آدمیوں سے خفا رہتے ہیں اور پھر اپنی خفگی کا سبب صیغۂ راز میں رکھتے ہیں۔ جب کوئی سیاسی ہنگامہ ہوتا ہو تب پہلے یہ اخبار نویسوں سے رو رو کر درخواست کرتے ہیں کہ ہمارا بیان چھاپئے۔ پھر عوام کو بتلاتے ہیں کہ ہم انڈر گراونڈ ہونے جا رہے ہیں۔ اس کے بعد پولیس والوں کی خوشامد کرتے ہیں۔ "ہم کو گرفتار کر لو پیارے"۔ مگر پیارے پولیس خود اپنے کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیتے ہیں ورنہ بھاگ کھڑے ہوتے ہیں۔ ان کا چہرہ میدان جنگ کا نقشہ پیش کرتا ہے۔ یہ ایک دوسرے سے چھین چھین کر بیڑیاں پیتے ہیں۔ اور قوم کے نام پر چائے پینے کی کوشش کرتے ہیں۔ جب یہ آپس میں بات کرتے ہیں تو ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تقریر کر رہے ہیں۔ جو لبنذ ہو کر نیولے اور سانپ کی لڑائی میں تبدیل ہو جائے گی اور معلوم ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو نگل جائیں گے۔ جب یہ چلے جاتے ہیں تو مالک ہوٹل بےچارا روتا ہے کہ چلتے چلاتے کل پھر آنے کی دھمکی دے گئے ہیں۔

چائے کی پیالی فریاد کرتے کرتے رک گئی اور پھوٹ پھوٹ کر

رونے لگی۔ پھر بولی۔" ارے آپ تو جا رہے ہیں۔ میں عمر بھر آپ کا احسان مانوں گی۔ خدا کے لیے مجھے اس جہنم سے بچائیے۔ میں سکون چاہتی ہوں، سکون
میں نے گھوم کر چاروں طرف دیکھا۔ میدان صاف تھا۔ چائے کی پیالی جیب میں ڈال نو دو گیارہ ہو گیا۔

رستم امتحان کے میدان میں

سہراب نے کہا ــــــــــــ

"ابا جان! کم سے کم ہائی اسکول ہی کر ڈالئے۔ میرے دوست مجھے جب چڑھاتے ہیں کہ تمہارے ابا تو میٹرک فیل بھی نہیں تو مجھے بڑی شرم آتی ہے۔"

رستم بولا ــــــــــــ

"ہم میٹرک فیل کر کے کیا کریں گے، ہمارے پاس خود ہزاروں میڈل خالص سونے کے پڑے ہوئے ہیں۔" مگر یہ بات رستم کے کلیجے میں تیر کے مثل لگی کہ یہ نئی پود ہم کو جاہل سمجھتی ہے۔ یعنی مملکت نیمروز کا بادشاہ، رستم جہاں، شیر تن پہلوان جاہل اور نان کوالی فائیڈ۔

ــــــــــــ

شب کو رستم نے خواب میں دیکھا کہ سہراب مٹھائی بانٹ رہا ہے، صبح اٹھ کر اس نے

منجموں اور کاہنوں کو طلب کر کے، اصل واقعۂ خواب کہہ سنایا۔ اور حکم دیا کہ جلد اصل حقیقت سے آگاہ کیا جائے۔ مگر جب دیر تک وہ خوف سے کچھ نہ بولے تو رستم نے کہا ــــــ "جلد بتاؤ ورنہ مار مار کر سب کو اُلّو بنا دوں گا۔ اچھا میں تم کو تین دن کی مہلت دیتا ہوں۔ کہ تم سب لوگ آپس میں بحث کر کے ایک سچّی تعبیر اس خواب کی مجھے بتاؤ ــــــ" دربار سے واپس ہو کر سب نے صلاح کی۔ "اب کیا کرنا چاہیے۔ اگر سچّی تعبیر بتلاتے ہیں تو خوف ہے کہ یہ غصّہ میں آکر ممتحن کو نہ مار ڈالے اور اس گھڑی اس کا اسکول سے رسٹی کیشن ہو جائے یا اس پر کیس چل جائے۔ اگر نہیں بتلاتے ہیں تو جان کا خوف ہے ــــــ" آخر ان میں سے ایک شخص جس کا کچھ یونہی سا نام تھا اپنی جان راست گوئی پر نثار کرنے کے لیے تیار ہو گیا۔ اور رستم کی خدمت میں حاضر ہو کر دو زانو مؤدب ہوا اور عرض کیا۔

"اے پہلوانوں کے پہلوان، یہ دُنیا دار الامتحان ہے۔ اس میں جو بیٹھے گا اُسے کسی نہ کسی دن ورنہ رات میں نتیجہ ضرور دیکھنا پڑے گا۔ نوشیروان عادل نے زمانۂ طالب علمی میں 'ٹاپ' کرنے کی کوشش کی، مگر اسے صرف پاس ہونے بھر کے نمبر لانے کے لیے نو بار امتحان میں بیٹھنا پڑا۔ کیسے کیسے شاہان اولوالعزم جو ٹاپ کرتے اور ولایت پڑھنے کے لیے بھیج دیئے جاتے۔ اُن کی ڈگریاں آج ہزاروں من مٹی کے نیچے دبی پڑی ہیں کہ دیمک بھی اُن تک جاتے گھبرائے، جس طرح آپ نے سہراب کو پڑھا لکھا کر سینیر کیمبرج کروایا۔ اسی طرح خاکم بدہن حضور کا سرٹیفکٹ ایک نوجوان مسمیٰ احقر لکھ کر بعد ایک مدت کے دے گا، یہی اس خواب کی تعبیر ہے۔"

رستم ــــــــــــ

"یہ ممتحن کون ہے اور ہم کو کیوں فیل کرے گا ــــــــــ"

نجومی نے زمیں بوس ہو کر جواب دیا ــــــــــ

"حضور، میرے منھ میں خاک! آپ محض نقل کرتے ہوئے پکڑے جائیں گے اور وہ آپ کی کاپی پر نشان بنا دے گا ــــ"

ــــــــــــــ

دوسرے دن خواب میں رستم کو ہیڈ ماسٹر صاحب نظر آئے۔ کہنے لگے۔

"کبھی ہم کو دیکھا ہے؟"

"جی ہاں ابھی ابھی خواب میں دیکھ لیا ہے"۔

اس پر وہ چراغ پا ہونے کی کوشش کرتے ہوئے بولے۔

"تجھ کو خدا سے شرم نہیں آتی کہ اس نے تجھے اس قدر منصب، جاہ و جلال عطا کیا اور حیف کہ تو تھرڈ ڈویژن میں دسواں بھی نہ پاس کر سکا۔ ارے رستم اتنا ہی پڑھ لیا ہوتا کہ کمپارٹ منٹل ہی میں آ گیا ہوتا۔"

دوسرے دن دوسرا خواب دیکھ کر رستم دوبارہ بیدار ہوا اور اختر شناسوں کو طلب کر کے خواب بیان کیا اور تعبیر پوچھی۔

ایک اور اختر شناس نے جو اختر شماری میں بھی دخل رکھتا تھا عرض کی۔

"بس اب آپ کو کسی اچھے ٹیوٹر کی تلاش شروع کر دینی چاہیے۔ ورنہ پھر شاہ افراسیاب کو آپ کی ہنسی اڑانے کا اچھا موقع ملے گا۔" تعبیر سن کر رستم نے سب

اختر شناسوں کو رخصت کیا کہ ریسٹورنٹ میں جاکر بیٹھ رہیں اور خود رخش پر سوار ہوا اس کی باگ زابلستان کی جانب پھیر دی اور رخش کے کان میں کہا، بس اب زابلستان ہی میں رکنا ہوگا، یہ سن کر رخش ہنہنایا، خدا کی قدرت کہ گھوڑا ہوکر سب کچھ سمجھ لیتا تھا۔ جدھر سے رخش گزر جاتا معلوم ہوتا کہ مانسون نکل گیا۔ جگہ جگہ زمین اس کے اور رستم کے مشترکہ بوجھ سے شق ہو جاتی اور زمین سے پانی کے فوارے چھوٹنے لگتے۔ جن کی موسیقی کانوں کو بڑی بھلی لگتی، سفر کی تکان نہ محسوس ہونے پاتی۔

زال کو جب آمد رستم کی خبر ہوئی تو خود استقبال کے لیے گیا۔ باپ کو آتا دیکھ کر رستم گھوڑے سے کود پڑا۔ راستے بھر دونوں خاموش رہے۔ رستم تکان کی وجہ سے اور زال رستم کی خاموشی کے سبب، دربار میں پہونچکر زال نے رستم کو گلے لگایا، اور حال چال دریافت کیے، رستم نے کہا۔ "چال تو آپ رخش کی دیکھئے جو مجھے یہاں تک لایا ہے، اور حال مجھ سے سنیئے ـــــ" پھر اس نے پورا واقعہ بتا دیا۔

زال نے نجومی طلب کیے، رستم کا زائچہ بنوایا۔ اور اس کی مارک شیٹ ٹیلی کرائی سب نے یک زبان ہوکر کہا ـــــ

"یہ تو بہت ہی جید اینگلو ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ پڑھے پہلے اور امتحان بعد میں دے ـــــ"

اس پر زال بیٹے کو خلوت میں لے گیا اور دل پہ جبر کر کے پوچھا ـــــ "بیٹا کہیں بڈھے طوطے بھی پڑھا کرتے ہیں ـــــ؟"

" رستم نے سر جھکا کر، آنکھوں میں آنسو لانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا ـــــ

"ابا جان اس وقت غالباً آپ سائنس کا پاٹھ بول رہے ہیں۔ طوطے تو طوطے اس عمر کی طوطیاں تک پڑھ سکتی ہیں"

یہ کہہ کر رستم نے شہادت کی انگلی بلند کی اور مشرق کی جانب اشارا کیا، جہاں ایک پنجرے میں ایک طوطا اپنا سبق پڑھ رہا تھا اور کئی طوطیاں اُسے بغور سُن رہی تھیں۔

بیٹے کی ذہانت دیکھ کر زال بے حد خوش ہوا اور بیٹے سے اُٹھ کر دوبارہ بغل گیر ہوا۔ اور سارے دربار کو رستم سے حکم بغل گیری سے سرفراز کیا۔ بعد اس کے اس پر بے زر و جواہر نثار کیا اور خلعتِ زرنگار سے نوازا ___ انعام و اکرام میں فونٹن پن کی کشتیاں سیکڑوں گھڑیوں میں نفیس اور عمدہ روشنائی کی ٹکیاں، حافظے کی گولیاں، اور صدہا بیٹی حبوب دماغ آور، کئی زریں کمر ردی کاتب، کئی سٹ ٹیوٹر، کئی گردش قلم دان، کئی رم کاغذ، اور ایک مکمل لائبریری، بنگ مین سیریز والی، کورس کی کتابیں، کلاس نوٹس، گیس اینڈ سالوڈ پیپرز سے مزین ___، اور رخصت کی اجازت طلب کرنے کے لیے شاہ کیکاؤس کی خدمت میں روانہ کیا ___

شاہ کیکاؤس بے حد ضدی بادشاہ اور بے وقوف آدمی تھا۔ جب اس نے سُنا کہ رستم یو۔ پی بورڈ سے ہائی اسکول کرنے جارہا ہے، پہلے تو اس نے سنی کو ان سُنی کرنے کے لیے کہا ___ "اچھا بتاؤ ہم نے یہ کس سے سنا ہے؟" رستم نے فوراً بتا دیا کہ "یہ آپ نے ہم سے سُنا ہے ___" اس پر وہ کچھ لاجواب اور کچھ نامعقول ہو گیا۔ اور اُس کی خبیثی منسوخ کر دی ___ مگر چونکہ رستم کا مذہب بادشاہ کی اطاعت کرنا تھا اس وجہ سے وہ خون کے کئی گھونٹ یک لخت پی گیا، مگر چپ نہ رہ سکا اور

ہائی اسکول میں بیٹھنے کی دوبارہ اجازت طلب کی، کیکاؤس دیکھتے دیکھتے غصّہ میں بھر گیا، اُس نے طوس کی جانب قہر آلود نگاہوں سے دیکھا جو اس وقت صرف چائے نوش کھانے میں مشغول تھا۔ اس نے تکھن لگاتے ہوئے کیکاؤس کی جانب دیکھا، کیکاؤس نے اُسے حکم دیا۔ "اسی وقت جا کر رستم کو دار پر چڑھا دے ــــ" طوس نے اطاعت شاہی کے زعم میں رستم پر ہاتھ ڈال دیا۔

رستم دیکھتے ہی دیکھتے آگ کا بگولا بننے لگا۔ اس نے ایک گھونسہ طوس کی پشت پر رسید کیا۔ طوس منھ کے بل زمین پر گرا۔ رستم کیکاؤس کی جانب دیکھ کر کہنے لگا۔ "آپ کے حواس درست ہیں۔ آخر کس کی شان میں اس گستاخی کا حکم دیا جا رہا ہے۔ یہ میرے احسانوں کا بدلہ مل رہا ہے، فلاں فلاں موقع پر میں نے آپ کی بادشاہت اور جان بچائی۔ یہ میرے احسانوں کا بدلہ مل رہا ہے۔ اب میں جاتا ہوں خواہ مجھے پرائیوٹ ہائی اسکول کیوں نہ کرنا پڑے۔ یہ میرے بچّے کی ترقی کا سوال ہے۔"

یہ کہہ کر رستم دربار سے نکلا اور گھوڑے پر سوار ہو کر قلعہ کے باہر نکل گیا۔ گودرز نے جو یہ رنگ دیکھا تو سرداروں کو تو رستم کو سمجھانے بھیجا اور خود کیکاؤس کو سمجھانے لگا۔ ــــ "آپ رستم کو علم حاصل کرنے سے روکتے ہیں، علم حاصل کرنے اگر آدمی پیدل چین جانے کا ارادہ ظاہر کرے تو اس کی ہمت بندھانا چاہیے۔ کہ ہو سکے تو جاپان بھی چلے جانا ــــ" اُس نے کچھ اس طرح سمجھایا کہ کیکاؤس کو اتنا کچھ سمجھ میں آ گیا کہ خود معافی مانگنے کے لیے دوڑا۔ غرض کیکاؤس نے معافی مانگی اور رستم نے معاف کیا۔

کیکاؤس نے بے اختیار اُس کے گلے میں باہیں ڈال دیں اور معذرت خواہ

ہوا ——— "تم نے سمجھنے میں غلطی کی، ہندوستان جانے کے لیے باقاعدہ پاسپورٹ بنوانا پڑتا ہے۔ یہ توران کی سرحد نہیں ہے کہ گورخر کا شکار کھیلنے کے لیے گئے اور ملک فتح کر آئے۔ ہندوستان سے ہمارے تعلقات پنچ شیل قسم کے ہیں۔ پھر اس نے ہندی سفیر کو طلب کر کے احوال بیان کیا۔ سفیر نے رستم کے تن تنہا جانے کی شرط منظور کر لی۔ کیونکہ یہ تن تنہا پوری فوج پر بھاری تھا، اور دوسرے اگر ان کی آمد کو صیغۂ راز میں نہ رکھا گیا تو لڑکے رستم کو گھیرے رہیں گے۔ نہ خود پڑھیں گے نہ انھیں پڑھنے دیں گے۔ یہ سفر کی تیاریاں شروع کر دیں۔ مگر اول تو انھیں ہندی پڑھنا ہوگی۔ دوم ان کو کالرے اور چیچک کے ٹیکے لگوانے پڑیں گے ——— ان کا پاسپورٹ اور ویزا جلد ہی مل جائے گا۔" ——— علم کے شوق سے مغلوب ہو کر رستم نے یہ شرطیں منظور کر لیں۔

غرض رستم نے جانے کی تیاریاں شروع کر دیں۔ بیٹے کو خدا حافظ کہنے کے لیے زال بھی اپنے ملک سے آ گیا تھا۔ رستم کا پاسپورٹ بھی بن کر آ گیا تھا۔ رستم جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ زال نے کہا، بیٹا احتیاطاً سہراب کو بھی اپنے ساتھ لے جاؤ کہ وہ گلیاں اس کی دیکھی ہوئی ہیں۔ پھر اس نے سمجھاتے ہوئے کہا ——— "یہ تو مجھے یقین ہے کہ تم اس امتحان پر بھی غالب آؤ گے۔ لیکن دو باتیں میری گرہ میں ڈال لو۔ ایک تو بنگال کی طرف نہ جانا کہ وہاں کا سحر مشہور ہے۔ دوسرے پنجاب سے گزر جانا لیکن آنکھ نہ اٹھانا کہ حسن میں بے مثال ہے اور لمحہ بھر میں آدمی پہلوان سے عاشق ہو جاتا ہے۔ اب رہا جانے کا تو زابل سے یو۔ پی جانے کے دو راستے ہیں۔ ایک راستے سے آدمی کئی مہینے میں پہونچتا ہے اور دوسری راہ سے دو ہفتہ میں ہی پہونچ جائے گا۔

پہلے راستے سے جانے میں خیال ہے کہ جب تک تم پہونچو کہیں ایسا نہ ہو کہ اسکول کھل کر بند ہو چکے ہوں۔ اور تمھارا داخلہ بھی نہ ہو سکے۔ اور دوسرا راستہ ایسا پُرخطر ہے کہ ہر ہر منزل پر نئی نئی بلاؤں کا سامنا ہوتا ہے ___ پہلے راستے سے جانے کی عقل ممانعت کرتی ہے۔ اور دوسرے راستے سے محبت اجازت نہیں دیتی۔ لہٰذا متردد ہوں کہ تم کو کس راستے سے جانے کی اجازت دوں۔" رستم نے عرض کی ___ "بلاؤں سے ڈرنا نامردی ہے۔ جتنا جلد ہو سکے مجھے ہندوستان پہونچنا چاہیے۔ غرضیکہ رستم قریب کے راستے سے جانے کے لیے تیار ہو گیا۔ واضح ہو کہ یہ راستہ اس قدر خطرناک مشہور تھا کہ رستم کے ساتھ جانے کے لیے اس کے ماسٹر صاحبان تک نہ تیار ہوئے۔

پڑھنے والو! رستم کی شجاعت کا اسی سے اندازہ کرو کہ اس نے تن تنہا جانے کا قصد کیا، اور دوسرے روز بغیر کسی سامانِ سفر کے بغل میں بستہ دبا، مسلح ہو کر رخش پر سوار ہوا۔ اور ہندوستان کا راستہ لیا۔

ہفت خوانِ رستم

پہلی منزل۔ نئی نئی بلاؤں کا سامنا } رستم اس تیزی سے راستہ طے کر رہا تھا کہ ایک ایک دن میں دو دو منزل کی مسافت طے کرتا تھا۔ پہلی منزل پر شام کے وقت رستم کو

معمول کے خلاف بھوک محسوس ہوئی۔ اس وقت رستم ایک سبزہ زار میں تھا جہاں ایک چشمہ شیریں بہہ رہا تھا، بہت سے صحرائی جانور چر رہے تھے۔ رستم نے ان میں سے ایک گورخر کا شکار کیا اور اس نے اپنا شکم سیر کیا، چشمے سے پانی پیا اور رخش کو چرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ اپنی تلوار کو تکیہ بنایا، گھڑی کا الارم لگایا، کیونکہ ادھر رستم علی الصباح اٹھ کر پڑھنے کا عادی ہو چلا تھا۔ اور یہ اس بکیٹس الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔ مگر تھوڑی ہی دیر میں تکان کے سبب بے تکان خراٹے بھرنے لگا۔ یہ مقام افراسیاب کی شکار گاہ تھا اور دشت وغوجلے کہلاتا تھا، اس مقام پر ایک جٹ فائٹر اترنے کے لیے چکر کاٹ رہا تھا جس نے یہاں سے فاصلے پر تجربہ کے لیے ہائیڈروجن بم پھینکا تھا، اور انجن کی خرابی کے سبب زمین پر اتر رہا تھا، مگر یہاں پر ہم کو یہ بھی شک کرنا چاہیے کہ ہو نہ ہو اس میں کچھ افراسیاب کی شرارت ہو اور وہ اس کے ذریعہ رستم کو اغوا یا بمبارڈ کروانا چاہتا ہو، بہر حال جیسے ہی طیارہ زمین پر رکنے کے لیے دوڑا تو رخش ہوشیار ہو گیا۔ دوسرا گھوڑا ہوتا تو جٹ فائٹر کی بو پا کر بھاگ جاتا۔ مگر رستم کا گھوڑا بھی یا ہی تھا۔ جیسے ہی جٹ زمین پر رینگا اس نے بڑھ کر ایک دولتی جھاڑ دی۔ جہاز سے شعلے بلند ہونے لگے، غرض رخش نے مارے ٹاپوں کے طیارے کو چکنا چور کر دیا۔ اور تھوڑی دیر میں طیارہ پورے بھر خاک میں تبدیل ہو گیا، جب طیارہ خاک سرد ہو گیا تو رخش پھر چرنے میں مصروف ہو گیا۔ علی الصباح جب الارم بجا اور رستم بیدار ہوا تو سامنے خاک کا تودہ نظر آیا۔ چند لکڑی و لوہے کے ادھ جلے منتشر ٹکڑوں پر رخش کی ٹاپوں کے نشانات دیکھے، سمجھا کہ میرے رخش نے اس کا شکار کیا ہے۔ شیر کی طرح رخش پر گرجنے لگا، اگر تجھ کو یہ اٹھا لے جاتا تو پھر مجھ کو ہندوستان تک کون

پہونچا تا۔ میں تو کہیں کا نہ رہتا۔ میری پہلوانی اور طالب علمی تیرے دم تک ہے۔
اب اگر آئندہ کوئی خطرناک واقعہ پیش آئے تو ہنہنا کر مجھے جگا دینا، خود نہ مقابل
ہونا (بھئی نہ معلوم کیسا گھوڑا تھا کہ ہر بات سمجھ لیتا تھا اور اس پر تائم ٹیبل بنا کر
عمل بھی کرتا تھا۔ خدا ایسا سعادت مند گھوڑا ہر ایک کو دے) لہذا رستم پہلے رخش پر
خفا ہوا پھر اس پر سوار ہو کر روانہ ہوا۔

رستم دو چار سو میل ہی چلا ہوگا کہ اسے ایک ریگستان نظر آیا۔ ریت کی وجہ سے
رخش کی رفتار میں کمی ہو گئی۔ تمازت آفتاب کے ساتھ ساتھ ریت میں بھی حدّت پیدا
ہو گئی۔ دھوپ سے رستم کی زرہ جلنے لگی۔ رستم کے بدن میں آگ لگ گئی۔ (مگر اب کچھ
بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ کیونکہ جنگل میں فائر بریگیڈ کہاں) اور اس کے بستے کی کئی
کتابیں جل گئیں۔ پسینہ اس قدر نکلا کہ رستم اور رخش دونوں سیراب ہو ہی گئے۔ مگر
اب بھوک کا غلبہ ہوا۔ رستم دور دور تک کھانے کی تلاش میں گھوڑا پھینکتا ہوا گیا لیکن
صحرا ختم ہونے کا نام ہی نہ لیتا تھا۔ مجبوراً بھوک سے بیدم ہو کر گھوڑے سے اترا اور
ریت میں تڑپنے لگا۔ جیسے ہی اسے اپنی مجبوری کا احساس ہوا فوراً خدا یاد آ گیا اور
گڑگڑا کر جو دعا کی تو درگاہ قاضی الحاجات میں اس کی دعا قبول ہوئی۔ رستم کے
سامنے سے ایک گورخر چوکڑیاں بھرتا ہوا گزر گیا، رستم نے اس کا پیچھا کیا، کچھ دور
چل کر ایک جنگل نظر آیا، کنارے ایک چشمۂ شیریں بہہ رہا تھا، گورخر کا شکار کر کے چشمہ
کی جانب متوجہ ہوا، خود پانی پیا اور گھوڑے کو پینے کی اجازت دی۔ پھر جنگل کے
اندر داخل ہوا۔ دیکھا تو فاصلے پر ایک گاؤں سا نظر آیا جہاں منگل ہو رہا تھا۔ رستم نے
چند اشیائے خوردنی پسند کیں اور کمر سے ایک اشرفی نکال کر دوکان دار کے آگے

ڈال دی۔ اُس نے اٹھا کر وہی اشرفی پھر رستم کے آگے ڈال دی، وہی پر تکرار ہوئی
وہ نئے پیسے مانگتا تھا اور یہ پرانے میں اس کا حساب صاف کرنا چاہتا تھا۔ رستم نے
پوچھا وہ کیسے؟" تو اس نے بتایا ــــ "اتنے پرانے پیسوں میں اتنے نئے جوڑ دو،
اتنے سے ضرب کر دو پھر اتنے سے تقسیم کر کے اس میں اتنے گھٹا دو تو تقریباً اتنے ہی
پیسے ہو جائیں گے ــــ" یہ سُن کر رستم نے اپنا سوا تین سو من کا گرز گاؤ سر اٹھایا
اور کہا ــــ "او اجل رسیدہ تو ہمیں حساب سکھانے چلا ہے ــــ" قریب تھا
کہ اس کا رشتۂ حیات منقطع ہو جائے کہ وہ پیروں پہ گر پڑا، اور بولا۔ "صورت سے
طالب علم معلوم ہوتے ہو۔ اگر اس کو نہیں سمجھو گے تو حساب کے امتحان میں فیل
ہو جاؤ گے ــــ" یہ سن کر رستم نے مارنے سے ہاتھ اٹھا لیا اور کہا۔ "خیر تیری
زندگی تھی جو بچ گیا۔ جانتا نہیں کہ میں رستم ہوں اور امتحان دینے نکلا ہوں۔
ــــ یہ سن کر اس نے رستم کا شکریہ ادا کیا اور نئے پیسے کا چارٹ اس کے
حوالے کیا۔ چونکہ ابھی دو گھڑی دن باقی تھا اس لیے رستم رخش پر سوار ہوا۔ ابھی
چند سو میل چلا ہوگا کہ ایک تیرہ و تار جنگل میں داخل ہوا۔ اس تاریکی میں اس کی سمجھ
میں نہ آیا کہ وہ آ رہا ہے یا جا رہا ہے۔ مجبوراً اس نے خدا کے بھروسہ اور رخش
کے سہارے لگام ڈھیلی کر دی۔ خدا کی قدرت کہ تاریکی دور ہوئی اور ایک سبزہ
زار میں جا نکلا، وہاں پر ایک دریا انگڑائی لے کر بہہ رہا تھا۔ سامنے ہرے بھرے
کھیت لہلہا رہے تھے۔ رستم گھوڑے سے اُترا اور مصروف نظارۂ قدرت ہوا۔
چہار اطراف کھیتیاں لہلہا رہی تھیں۔ خوشنما چرند و پرند اپنی اپنی بولیوں میں مست
تھے، اتنے میں رستم نے کچھ شور سنا۔ پلٹ کر دیکھا تو رخش چرتے چرتے ایک کھیت

میں داخل ہو گیا تھا اور ایک حور شمائل اس کو ڈانٹ رہی تھی۔ رستم معذرت کے خیال سے آگے بڑھا اور رخش کو روکا۔ ناگاہ جنوب سے اس نازنین کا بھائی برآمد ہوا اور سمجھا کہ اجنبی کی وہ شکایت کر رہی ہے۔ اس نے غصہ میں بھری ہوئی پستول چلادی۔ اتفاق کی بات کہ نشانہ خطا کر گیا اور گولی ایک کتے کے لگی جو فوراً مر گیا ـــــ رستم سمجھ گیا کہ اہلِ ہند کے اس حربے کا جواب ممکن نہیں، چنانچہ اس نے بڑھ کر اس آدمی کو اصل ماجرا سنایا۔ اور لاعلمی کا اظہار کیا تب جا کر رستم کو نجات ملی۔ مگر وہ اس خلافِ معمول واقعہ سے اتنا گھبرا گیا تھا کہ اس نے بلا کسی تکلف کے اس سے درخواست کی کہ "میں آپ کا مہمان ہونا چاہتا ہوں"۔ مہمان کا لفظ سُن کر اس کا چہرہ فق ہو گیا۔ مگر اس نے اپنے کو سنبھالا اور کہا۔ "مگر شرط یہ ہے کہ دال بھات اور مچھلی کے سوا ہرگز کچھ طلب نہ کرے گا ـــ" رستم نے شرط منظور کی اور اس کے ہمراہ ہوا ــــــ اس نوجوان کے بال سفید اور جسم جوان تھا۔ رستم نے اس سے دریافت کیا کہ "تیرے یہ کھچڑی بال جن میں دال کم اور چاول زیادہ ہیں تو نے دھوپ میں سفید کیے ہیں یا چھاؤں میں، اس پر وہ ہنسا اور بولا۔ "اس کا سبب نزلہ ہے" ـــ رستم نے پوچھا کہ کس قسم کا نزلہ"۔ اُس نے مسکرا کر کہا۔ "بن بلائے مہمانوں کا نزلہ" ـــــ اس پر رستم کا خون کھول گیا اور بولا ـــ "میں رستم ہوں ــــــ"

جب اُس نے سنا کہ یہ رستم ہیں، اور طالب علم بھی، تب وہ ہنس دیا۔ مگر رستم مصلحتاً خاموش ہو گیا۔ کیونکہ اسے تو یہاں پر جیسے تیسے رات گزارنا تھی صبح سویرے اٹھ کر اس نے غسل کیا۔ اسلحۂ جنگ لگا کر بغل میں بستہ دبایا۔

اور چلنے کے لیے رخش کی زین کسنے لگا، مگر جب اہلِ خانہ نے سُنا کر ان حضرت کو یوپی جانا ہے تو ان لوگوں کو ایک بار پھر ہنسی آگئی ــــ کہ "آپ تو بنگال کی جانب نکل آئے۔ اب آپ کو واپس جانا پڑے گا۔" رستم کے لیے بالکل نیا تجربہ تھا کہ وہ جانے کیلئے لوٹ کر جائے۔ غرضکہ اس نے خدا کا نام لیا اور رخش پر سوار ہوا۔ بڑی دیر تک پہاڑوں اور میدانوں میں گھوڑا دوڑاتا رہا۔ دوپہر کو اس نے دریا کے کنارے کئی گورخر شکار کیے۔ ان کے کباب بنا کر کھائے۔ پانی پیا اور پھر روانہ ہوگیا۔ شام کو ایک بستی میں داخل ہوا اور راہ گیر سے سرائے دریافت کی ــــ اس نے کہا سرائے تو نہیں، البتہ ہوٹل ہیں۔ آپ مسافر معلوم ہوتے ہیں۔ آئیے میرے مکان پر قیام کیجئے ــــ رستم راضی ہو گیا۔ اس نے گھر لے جا کر دال بھات پیش کیے اور بولا۔ "اگر میرا اندازہ غلط نہیں تو آپ ضرور کسی نہ کسی بھتیٹر کے جوکر ہیں۔ اسی لیے میں اپنا دل بہلانے کے لیے لے آیا کہ دو گھڑی کی تفریح ہی سہی۔

ــــ رستم نے کھانا زہر مار کرتے ہوئے کہا ــــ "ہم رستم ہیں! رستم! اس کے آگے پیچھے اگر کچھ ہیں تو پہلوان ہیں ــــ" اس نے کہا ــــ "میاں کان پکڑو ــــ بھلے گھر کے معلوم ہوتے ہو۔ اپنے کو پہلوان بتلاتے ہو، جانتے نہیں پہلوان یہاں دادا ہوتا ہے جو سنیما میں ٹکٹ کی بلیک کرتا ہے ــــ" یہاں رستم کو ایک ساحرہ نے کوٹ اور پتلون پہنا کر باقاعدہ اس کی تصویریں اُتروالیں ــــ شام کو یہ اس مقام کی سیر کو نکلا، تو اتفاق کی بات کہ دور سے اسے سہراب آتا دکھائی دیا جو دوسری راہ سے چلا تھا اور راہ بھٹک کر ادھر آنکلا تھا۔ سہراب کو وہ اپنے ساتھ لے آیا، مگر اس نے جو باپ کے یہ رنگ ڈھنگ دیکھے تو اس نے رات کو ٹوکا ــــ "اباجان یہ سب کیا ہے آپ تو پڑھنے آئے تھے اور یہاں آکر فیشن میں پڑ گئے ــــ اگر

یہی رفتار رہی تو آپ کا پڑھنا ہو چکا ـــــــ رستم نے اس سے دل لگا کر پڑھنے کا وعدہ کیا اور پھر سو گیا ـــــــ

رات گزری، نور کا تڑکا ہوا ـــــــ ہوشیار اسکول کا لڑکا ہوا

صبح کو الارم پر رستم کی آنکھ کھلی، اٹھ کر ہاتھ منھ دھویا، عبادت کی، پھر پڑھنے بیٹھ گیا۔ بڑی دیر تک سبق یاد کرتا رہا۔ اس کے بعد اُس نے سہراب کو بیدار کیا، چلنے کی تیاری کی، میزبان کا شکریہ ادا کیا۔ سہراب نے اسے ریل پر سفر کے بے شمار فوائد بتائے کیونکہ سہراب کی ہر بات رستم مان لیتا تھا اس لیے وہ ریل پر سفر کرنے کو تیار ہو گیا ـــــــ سہراب نے ریل کے ٹکٹ خریدے، رخش کو بک کرایا اور دونوں لکھنؤ جانے کے لیے سوار ہو گئے ـــــــ

دوسری منزل
اسکول کا سامنا

لکھنؤ دیکھ کر رستم کی آنکھیں کھل گئیں ـــــــ سہراب نے رخش کا لائسنس بنوایا ـــــــ اور رستم کو اسکول میں داخل کر دیا۔ داخلے کے وقت رستم کو یہ دقت پیش آئی کہ اسے تصدیق کرنا تھی کہ میں ہی رستم ہوں۔ اس سلسلہ میں سہراب نے اُسے کئی افسروں سے بھی ملوایا، مگر ہر ایک یہی کہتا تھا کہ ـــــــ "ہم یہ تو لکھ سکتے ہیں کہ آپ کا نام رستم ہے۔ لیکن یہ نہیں لکھ سکتے کہ آپ ہی رستم ہیں ـــــــ سہراب نے مشورہ دیا۔ فی الحال اسی سے کام چلایا جائے، مناسب وقت آنے پر یہ بھی ثابت کر دیا جائے گا کہ رستم کون ہے۔" غرض بڑی دوڑ دھوپ اور دفتری خانہ پری کے بعد رستم کا اسکول اور ہوسٹل میں داخلہ ہو گیا ـــــــ اس کے بعد سہراب اُسے اسکول گھمانے لے گیا اس نے دکھانا شروع کیا۔ "دیکھئے یہ اسکول کی عمارت ہے، یہاں پر اسکول کے مالی رہتے

ہیں۔ وہ اسٹاف کے کوارٹرز اور باغ ہیں۔ باغ میں لڑکوں کا جانا منع ہے اس وجہ سے
چھپ کر جانا پڑتا ہے، یہ کلاس روم ہے، ادھر کونے والا ہال لائبریری کا ہے۔" غرض
گھماتے پھراتے سہراب ایک اونچی سی عمارت کے سامنے آکر رک گیا۔ اور ایک ڈھیلا
کھینچ کے بالائی منزل کی کھڑکی پہ مارا، یک لخت کھڑکی کھلی اور ایک نہایت برہم اور
غضب ناک صورت نمودار ہوئی، چہرہ پہ غیظ و غضب کے آثار نمودار تھے۔ سہراب نے
اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا ——— "اور دیکھئے۔ یہ ہیں ہمارے پرنسپل
صاحب" ——— اور معصومیت سے آگے بڑھ گیا۔ کمرے واپس آکر رستم نے
بڑی محنت سے ٹائم ٹیبل نقل کرکے سامنے دیوار پہ آویزاں کیا۔ سہراب اسے
دیکھ کر بولا۔ بیکار آپ نے محنت کی، میرے زمانے میں بھی بالکل یہی تھا۔ میں آپ کو
دے دیتا۔ خیر اب اسے ضائع نہ کیجئے گا، جب تک آپ دسویں میں رہیں گے یہ برابر
آپ کے کام آتا رہے گا ——— اس کے بعد رستم نے سلیبس کی جانب توجہ کی۔ اس نے
بڑی توجہ کے ساتھ پورے کورس اور کتابوں کا حساب لگایا۔ پھر بولا، سمجھ میں نہیں آتا! اگر
روزانہ سو ڈیڑھ سو صفحے سمجھ کر پڑھ ڈالے جائیں، تب بھی خاصا کورس باقی رہ جائے گا
جو امتحان بعد پڑھا جا سکتا ہے۔ مگر اس کا امتحان نہیں دیا جا سکتا ——— "سہراب
یہ سن کر ہنسا کہ" ابا کی باتیں ——— " ارے یہ تو ہاتھی کے دانت ہیں۔
دکھانے والے، یہاں پڑھائی پہ تھوڑی زور دیا جاتا ہے، یہاں تو بس امتحان دینا
ہوتا ہے، صرف پاس کرانے کے لیے جو وہ بتا دیں وہی رٹ لیجئے اور امتحان میں
لکھ آئیے۔ پڑھنے وڑھنے کے پھیر میں پڑیئے گا تو پاس ہونے کے بھی لالے پڑ
جائیں گے ——— رستم بولا ——— "اسکول ہے کہ دوکان ——— " سہراب نے

کہا۔ "دوکان نہیں، ہول سیل کی دوکان ہے بس ٹکسال سمجھئے جس میں بجائے سکوں کے ہائی اسکول کے سرٹیفکیٹ سکوں کے لیے نکالے جاتے ہیں۔" رستم کی یہ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ سب لڑکوں کے لیے ایک ہی نسخہ اور ایک ہی پرچہ ترکیب استعمال، جبکہ کوئی لڑکا بیوقوف ہے تو کوئی ذہین۔ کسی کا رجحان کسی جانب ہے۔ کوئی کھیل میں اچھا ہے پڑھنے میں خراب، کوئی حساب میں کمزور ہے مگر سائنس میں تیز ہے۔ مگر ایک ہی طرح کے کورس سے سب کا بھلا کیسے ہو سکتا ہے۔" مگر سہراب نے پھر سمجھایا کہ اس پھیر میں نہ پڑیئے۔ اس کے لیے ماشاءاللہ اس ملک میں لیڈر کافی موجود ہیں۔ یہاں ہر شخص لیڈر ہے، مگر وہ بھی اس ڈر سے نہیں سوچتے کہ سوچا اور گئی ہاتھ سے لیڈرشپ۔ آپ تو ابھی نئے نئے ہیں، یہ بھی نہیں چلے گا کہ کدھر سے آئے تھے اور کدھر چلے گئے۔ بس آپ ابھی سے اپنی رٹن دوّا شروع کر دیجئے۔

رستم کے لیے بڑی پریشانی یہ تھی کہ وہ پڑھائی کے لیے پرسکون ماحول چاہتا تھا، مگر ایک تو دن رات اسکول ہی میں درجوں کا شور ہوتا رہتا تھا اور گھنٹے بجتے رہتے کیونکہ اسکول چھوٹا تھا اور لڑکے زیادہ تھے۔ اس وجہ سے روزانہ تین شفٹ ہوا کرتی تھیں، اوپر سے مصیبت یہ کہ اسکول ایک گنجان محلے میں واقع ہوا تھا اور سامنے بازار تھا جس کا شوروغل سب سے بڑھ چڑھ کر تھا۔ پہلے پہل جب وہ ہوسٹل کے کمرے میں گیا تو اس نے اعتراض کیا کہ میں یہاں رخش کو کیسے باندھوں۔ اس میں اس کا دم گھٹنے لگا ۔۔۔۔" سہراب نے بتایا "یہاں آپ گھوڑا نہیں باندھ سکتے ۔۔۔۔ یہاں تو ہم آپ کو باندھا جاتا ہے ۔۔۔۔" جب اسے معلوم ہوا کہ ان تنگ و تاریک کمروں میں رہنا پڑتا ہے تو اس کا دل بیٹھ گیا اور اس کو وحشت ہونے لگی۔

گرفتہ رفتہ سہراب اسے سمجھا بجھا کر راہ راست پر لے آیا اور وہ اس وحشت کا عادی ہو گیا۔ مگر اسے یہ اطمینان تھا کہ اس کا کمرہ کلاس دم سے پھر بھی ہزار درجہ بہتر ہے گو جہاں بارش میں اتنا پانی بھر جاتا ہے کہ کشتی کی ضرورت پڑتی ہے اور اگر ایک طرف کی چھت نہ ٹوٹی ہوتی تو شاید اس میں دھوپ اور روشنی کی کرن بھی نہ پہونچ سکتی، اور جس میں ایک ایک کرسی پر کئی کئی لڑکے بیٹھتے ہیں۔ پھر بھی جو دیر میں پہونچتا ہے اس بیچارے کو جگہ نہ ملنے کی وجہ سے کھڑا رہنا پڑتا ہے، اس مرغی کے ڈربے سے تو یہ گھوڑے کا تھان ہی بہتر۔ اسے اس خیال ہی سے وحشت ہونے لگی کہ جب یہ بہت اچھا اسکول ہے تو خراب اسکول کیسے ہوتے ہوں گے۔ اسے اسکول کی زندگی دنیا سے بالکل الگ تھلگ سی معلوم ہوتی۔ جیسے یہاں کا باوا آدم دنیا سے نرالا ہے۔

تیسری منزل

استادوں سے سابقہ

چونکہ ابھی داخلے ہو رہے تھے اس لیے اگر کلاس میں لڑکے آجاتے تو استاد نہ آتے اور استاد آجاتے تو لڑکے چلے جاتے۔ مگر اس کے باوجود رستم گھنٹہ ختم ہوتے ہی بھاگ کر دوسرے درجہ میں زن سے جا کر آگے بیٹھ جاتا۔ اس کی جسامت اور ہیبت سے لڑکے کائی کی طرح پھٹ جاتے اور یہ اطمینان سے بالکل آگے بیٹھ جاتا۔ مگر ماسٹر صاحبان کے رویہ سے وہ بڑا مایوس ہو جاتا۔ وہ تو خوب سبق تیار کر کے جاتا، اور ان کا یہ عالم کہ اکثر ماسٹر صاحب کو یہی نہیں معلوم ہوتا کہ آج پڑھانا کیا ہو۔ اکثر ادھر ادھر کی باتیں بتا کر چلے جاتے، ایک دن سیوکس کے ماسٹر صاحب نے لڑکوں سے جب اصرار کیا کہ وہ خود اور دوسروں سے بھی ایک خاص پارٹی کو ووٹ دیں اور دلوائیں، تو رستم کو بڑا تعجب ہوا کہ یہ عجیب چھپے رستم نکلے، پڑھاتے کچھ ہیں اور سکھاتے کچھ

ہیں۔ ایک صاحب تو غلط سلط پڑھا جاتے تھے۔ ماسٹر صاحبان پڑھا کر اس طرح چلے جاتے جیسے ریڈیو پر کوئی بھیر دیں بھیر کر چلا جائے۔ لڑکوں کو کوئی لفٹ ہی نہیں دیتے۔ لڑکے بھی بیچارے جاتے گھبراتے ——— لیکن جب کوئی لڑکا 'جیومیٹری' کے تھیورم رٹ کر نہیں لاتا، تب اس پر بڑی ڈانٹ پڑتی، ایک بار رستم نے کہا میں سمجھ گیا ہوں، تو انھوں نے اسے سزا دی اور کہا سمجھنے کی قطعی ضرورت نہیں ہے، بس آپ رٹ لیجئے ———" اس پر رستم کا دل پڑھنے کی جانب سے کچھ اُچاٹ ہو گیا۔ دوسرے دن وہ جماعت میں جا کر سب پیچھے بیٹھا اور دو ایک لڑکوں کی "پراکسی" بولی۔ ڈیسک کے اندر منھ کر کے دو ایک بار مرغے کی بولی بولی، پھر بڑی دیر تک بلیڈ سے ڈسک پر ستار بجاتا رہا ——— ماسٹر صاحب نے اس سے سوال کیا کہ بتاؤ بارہ آنے میں کتنے پیسے ہوں گے؟" رستم نے بہت سوچ کر بڑی دیر تک انگلیوں پر گننے اور حساب لگانے کے بعد کہا ——" بغل والے لڑکے سے پوچھ لیجئے وہ جانتا ہے ———" اب رستم نے یہ وطیرہ نکالا کہ جو ماسٹر پڑھاتا اُسے وہ سنجیدگی سے سُنتا، اور جو ماسٹر صاحبان کلاس میں اونگھنے کے بہانے خراٹے لیتے ان کے گھنٹے میں وہ خوب خوب شرارتیں کرتا۔ اس میں پورا درجہ اس کا ساتھ دیتا۔ غرض بڑے مزے سے دن گزرتے۔ مزے بھی ایسے جو زیادہ تر کلاس میں آتے۔

چوتھی منزل
اسکول کے میدان میں

رستم اسکول میں داخل ہوتے ہی لڑکوں میں مقبول ہونا شروع ہو گیا تھا۔ لڑکے اُسے گھیرے رہتے اور وہ نئے نئے کر رستم کی بہادری کے قصّے ان کو سنایا کرتا۔ طلباء نے اس کو یونین کے الکشن میں کھڑا کر دیا، حریف کی ضمانت ضبط ہو گئی اور پٹتے پٹتے بچا، ساتھ ہی اس کو 'اسکول جم' کا سکریٹری بھی بنا دیا گیا، غرض ہر طرف رستم ہی رستم

دکھلائی دیتے ـــــ مگر رستم کو دکھ اس بات کا تھا کہ عام لڑکا ان دلچسپیوں سے
دور ہی رہتا، کام کوئی بھی نہ کرتا۔ اگر لڑکے کھیل کود میں ذرا بھی حصہ لینے کی کوشش
کرتے تو ان کے والدین اور اساتذہ اُن سے بے حد خفا ہوتے کہ اب یہ حضرات کتاب
پر سے نظر ہٹا رہے ہیں۔ بس ہو چکے پاس واس۔ مگر جب کوئی کام ہوتا تو سب لیڈر بن کر
سامنے آجاتے اور وہ جوتیوں میں دال بٹتی کہ مجبوراً رستم کو اپنا گرز سیدھا کرنا پڑتا
اور سارا ہڑبونگ ہنگامہ یک لخت ختم ہو جاتا۔ ادب اور آرٹ سے دلچسپی تو دور کی بات ہے اگر
کوئی کلچرل پروگرام رستم بیٹھک کی کوشش کرتا تو استاد ڈرتے یہ کیا غضب کر رہے
ہیں، کہیں ان لہو ولعب میں پڑ کر لڑکے رٹنا نہ بھول جائیں۔ مگر سب رستم کا گرز تھا کہ
باوجود مخالفتوں اور اندیشوں کے سسٹم یسٹم سب کچھ اندھا دھند چلا رہا تھا۔ چونکہ اس کا اکیلا
ہی دم تھا جو ہر چیز میں نظر آتا اس لیے درجہ میں آنا جانا بھی نسبتاً کم ہو گیا۔ اگر گیا بھی تو
کسی کو بلانے یا پروگرام بتاتے، نتیجہ یہ ہوا کہ اس کی حاضریاں کم ہونے لگیں۔ سہراب نے
بارہا سمجھایا بھی کہ درجے میں نہ جائیے تو کم از کم کسی سے پراکسی کے لیے کہہ دیا کیجیے، یا
مہینے کے آخر میں جاکر حساب بیباق کر آیا کیجیے۔ مگر رستم نے ان غیر ضروری باتوں پر
مطلق دھیان دینا مناسب نہ جانا۔

رستم نے اپنی جم کا سالانہ جلسہ بڑی دھوم دھام سے کروایا۔ جس کی صدارت کے
لیے اس نے رستم زماں، رستم ہند حضرت گاما پہلوان کو بلوایا، خود اپنے کو اول انعام دلوانے
کے لیے بڑی دوڑ دھوپ کرنا پڑی، کئی بار جج بدلنا پڑے، اس موقع پر دو باہر کے
پہلوانوں کا چیلنج رستم نے اس شرط پر قبول کر لیا کہ وہ دونوں اس سے ایک ساتھ لڑیں۔
جب دو علاوہ پہلوان اس سے لڑنے کے لیے اکھاڑے میں اترے تو رستم نے تال ٹھونک کر

پہلے ہی راؤنڈ میں دونوں کو اپنے ہاتھ پر بلند کر کے تماشائیوں سے کہا، دیکھئے حضرات! یہ دونوں اپنے آپ کو پہلوان کہتے ہیں۔ اور دوسرے راؤنڈ میں اس نے ان دونوں کو ہوا میں اچھال کر تماشائیوں پر پھینک دیا۔ جلسہ گاہ میں بھگدڑ مچ گئی۔

اس جلسہ کے بعد تھکن اتارنے کے خیال سے رستم کو بہت زمانے کے بعد سیر و شکار کی یاد آئی۔ اور وہ اسلحہ جنگ سے آراستہ ہو کر رخش پر سوار ہوا۔ یہ جنگل کی تلاش میں آبادی سے باہر نکل گیا۔ دور سے اسے ناگاہ ایک جنگل نظر آیا جس میں شکاریوں نے غالباً شکار پھانسنے کے لیے جگہ جگہ جنگلے لگا رکھے تھے۔ رستم نے جاتے ہی شیر کا شکار کیا۔ پھر ایک جھنڈ ہرنوں، چکاروں اور بارہ سنگھوں کا ملا، رستم نے تیر سے کئی ہرن شکار کیے۔ اس کے بعد چشمے پر گیا اور آبی پرندوں کا شکار کیا، غرض رستم شکار میں مصروف تھا، اس نے ہر طرف مار مار کے جانوروں کے کشتوں کے پشتے لگا دیے۔ اس کا خیال تھا کہ غالباً یہ کسی کی پرائیوٹ شکار گاہ ہوگی کہ اچانک اسے کچھ بدنظمی کے آثار نظر آئے۔ بہت سے لوگوں نے اسے گھیر لیا، پولیس بھی آگئی، مگر چونکہ سب نہتے تھے اس لیے رستم نے بجائے ان پر حملہ کرنے کے انھیں سوالات کرنے کی اجازت دے دی۔ یہ اجازت دیکھتے دیکھتے پریس کانفرنس کی صورت اختیار کر گئی۔ اس کے بیانات اور تقاریریں لی جانے لگیں، رستم کا کہنا تھا کہ "میں یہاں شکار کی غرض سے آیا تھا" اور وہ لوگ کہتے تھے کہ ہم آپ کو گرفتار کرلیں گے۔ کیونکہ جسے آپ شکار گاہ سمجھ رہے ہیں۔ "عجائب گھر" ہے مگر جب ان لوگوں کو معلوم ہوا کہ رستم ایرانی ہے۔ اور نہ صرف غلطی تسلیم کرنے پر تیار ہے بلکہ معقول معاوضہ بھی اس نقصان کے ادا کرنے کے لیے دے گا تو ان لوگوں نے اس کا پتہ لے کر اپنا راستہ لیا اور رستم حیران و پریشان ہاسٹل واپس لوٹ آیا۔

اسی دوران میں لڑکوں نے رستم کو متعدد فلم بھی دکھائے۔ اکثر وہ فلمی گانے

گنگنایا کرتا تھا، ایک دن اس نے اپنے ایک اُستاد سے جن کی وہ بہت زیادہ عزت کیا کرتا تھا، دریافت کیا۔ "لے مری ٹوپی لپٹ کے" اور "تیل مالش" کے کیا معنی ہیں؟"۔ مگر جب انھوں نے بتایا کہ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں تو اسے بڑا تعجب ہوا کہ اہل ہند ایسے گانے بھی تیار کر لیتے ہیں جو مہمل ہونے کے باوجود قبول عام کی سند پا جائیں۔ اسکول میں جو سالانہ جلسہ ہوا تھا محکمۂ اطلاعات نے اس کی فلم بھی لی تھی۔ اس میں رستم کے کئی پوز تھے، رستم نے اسکول میں نمائش کے بہانے وہ فلم منگالی تھی اور ریہرسل کے بہانے روزانہ ہال بند کر کے وہ اس فلم کو چلواتا اُسے دیکھ دیکھ کر اسے خوشی اور حیرت ہوتی کہ بیک وقت وہ تماشا دیکھنے والوں میں بھی ہے اور تماشے میں بھی موجود ہے ——— یہاں بیٹھا، وہاں کھڑا ہے۔

پانچویں منزل
بورڈنگ ہاؤس میں

رستم کی کوٹھری جسے سہراب نے کمرہ بتایا تھا اور رستم نے اس کا نام "رستم ہال" رکھ دیا تھا۔ اس "رستم ہال" میں جو بورڈنگ ہاؤس کے بیچوں بیچ میں تھا۔ اس وجہ سے رستم نے خط و کتابت کا پتہ "رستم ہال ——— بورڈم ہاؤس" تجویز کیا۔ اور اس کی زیادہ تر خط و کتابت اسی پتہ پر ہوتی تھی۔ اس ہال میں رستم اور سہراب کے علاوہ تین درویش اور رہتے تھے۔ عموماً جس وقت رستم پڑھنے کی کوشش کرتا، یہ چہار درویش خوب شور کرتے۔ اس شور میں باتیں کرنے اور لڑنے کے پروگرام کے علاوہ ڈھول دھپے کا بھی سلسلہ رہتا، جس میں شرکت کرنے کے لیے آس پاس کی کوٹھریوں کے زائرین بھی کثرت سے آجاتے۔ گویا ایک تو رستم ہال کا شور و غل، پھر پورے ہاسٹل کی چیخ پکار، ہوئے دن کوئی نہ کوئی ہنگامہ یا دنگا فساد ضرور ہوتا جس میں دونوں فریق

عموماً انصاف کے لیے رستم کے پاس آتے اور رستم ہال تھوڑی دیر کے لیے خفیفہ کی عدالت میں تبدیل ہو جاتا۔ یوں بھی کوئی کسی کی ذرا کم ہی پرواہ کرتا۔ یہاں کا سب سے بڑا قانون یہ تھا کہ یہاں کوئی قانون نہیں تھا، نگراں حضرات کو سیاست لڑانے سے فرصت نہ ملتی۔ لڑکے بھی زیادہ نہ ڈرتے، کیونکہ اگر ایک پارٹی ان کو سزا دیتی تو دوسری پارٹی ان سزاؤں کو معاف کر دیتی، لڑکے بھی سمجھتے کہ سزا کون دے گا اور کس کو دے گا۔ اگر سزا دی بھی گئی تو معاف تو کر دیے جائیں گے۔ اس لیے سب من مانی کرتے۔ ہوسٹل شہر کے سب سے گنجان محلے میں واقع تھا مگر کالج سے اتنی دور کہ گھنٹہ بھی نہ سنائی دیتا۔ عموماً گھنٹوں کا یہ حساب رہتا کہ جب لڑکے پہونچ جاتے تب ہی گھنٹہ شروع ہو جاتا۔ اکثر شروع ہی نہ ہو پاتا کیونکہ ماسٹر صاحب نہ آتے۔ اور لڑکے ذرا بھی موقع پاتے تو بازار کی سیر و تفریح کے لیے نکل جاتے۔ سینما کی گھنٹی تو بستر پہ لیٹے لیٹے سنی اور سینما کا پروگرام بنایا جا سکتا، مگر اسکول کا گھنٹہ پھاٹک پر سے بھی نہ سنا جا سکتا تھا ــــــ عموماً لڑکے راستے ہی میں چائے خانوں میں گپ شپ کے لیے رک جاتے، اور اسکول تک اسکول ختم ہوتے ہوتے تک اکثر پہونچ بھی جاتے۔ غرض اسکول سے الجھن ہوتی اور بورڈنگ بالکل قید خانہ معلوم ہوتا۔ بورڈنگ اس گنجان علاقہ میں واقع ہوا تھا کہ روک ٹوک ممکن ہی نہ تھی، جس کا جس طرف سے جی چاہے آ جائے اور جس طرف سے چاہے چلا جائے۔ یوں تو لڑکے جمع رہتے اور گپ شپ کا بازار گرم رہتا۔ ہر شخص باہر گیا نظر آتا۔ لیکن اگر کوئی علمی، ادبی، تعزیتی نشست ہوتی تو سر مہ لگانے کو بھی لڑکا نہ ملتا اور ایک آدھ بار انتظام رستم کے ہاتھ میں ہوا تو رستم نے لڑکوں کو روکنے کے لیے چائے کا انتظام کیا۔ مگر لڑکے چائے پی کر چل دیئے۔

آئندہ رستم نے بعد میں جاری رکھی۔ جیسے ہی جلسہ ختم ہوا سب لڑکے آ گئے۔ بورڈنگ میں کھانا اتنا اچھا ملتا تھا کہ جسے صرف دیکھ کر ہی بھوک بھاگ جاتی تھی۔ اگر پھر بھی کچھ بھوک رہ جاتی تو وہ دو ایک نوالے کھانے کے بعد غائب ہو جاتی اور بے اختیار گھر یاد آنے لگتا۔

چھٹی منزل
کلاس میں مقابلہ

رستم کی شجاعت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ وہ کلاس میں داخل ہوتے ہی اپنی سب پہلوانی بھول جاتا اور نصابی مسائل میں الجھ کر رہ جاتا۔ کلاس میں پڑھائی کا جو معقول طریقہ بنایا جاتا تھا اس سے رستم کا جی الجھتا تھا، کورس کی بیشتر کتابیں مہمل تھیں جن کو بڑی محنت سے اور مہمل طریقہ سے پڑھایا جاتا تھا، رٹنے پر اس قدر زور دیا جاتا کہ اسے الجھن ہوتی، گویا وہ اپنا وقت ضائع کر رہا ہے۔ کتابیں سے ہٹ کر بات کی اور استاد نے خبر لی۔ خیر رستم کو تو صرف امتحان ہی دینا تھا مگر اور لڑکے پریشان رہتے تھے کہ اچھا امتحان بھی دے لیا اور پاس بھی ہو گئے۔ پھر کیا ہو گا؟ رستم نے اکثر کو سمجھایا بھی کہ "آخر ایسی بھی کیا پریشانی ہے۔ نوکری نہ ملے، کوئی پرواہ نہیں۔ میرے ساتھ سیستان چلو میں تم کو اپنی فوج میں بھرتی کر لوں گا ——" مگر لڑکے یہ سن کر اور بھی اداس ہو جاتے کہ اس طرح وطن چھوٹ جائے گا۔ لڑکوں میں کلاس میں نہ ایکا تھا نہ ساتھ کاندھے سے کاندھا ملا کر چلنے کی خواہش، بلکہ مقابلہ کی خواہش زیادہ شدید رہتی۔ سب قیدیوں کی طرح چھٹی کا اس طرح انتظار کرتے گویا اب جیل خانے سے نجات ملنے والی ہے۔ رستم نے طے کر لیا تھا کہ امتحان کے بعد لوٹ کر بھی اسکول کی طرف نہ دیکھے گا —— خیر دو ایک استاد تو کافی معقول نکلے، انھوں نے

امتحان سے کچھ قبل کمرہ بند کر کے سوالات لکھوا دیئے اور اُن کے جوابات بھی کہ تیار کر دیں امتحان میں آ رہا ہے۔ اور دو ایک نے معذوری ظاہر کی، مگر وعدہ کیا کہ فکر نہ کرو۔ پرچہ نہ سہی کاپی تو ہمارے پاس آئے گی۔ ہم پڑھا نہیں سکے تو تم پڑھ نہیں سکے تو کیا ہوتا ہے۔ پاس تو سب کو کر ہی دیں گے۔ مگر پھر بھی رستم کو اندازہ ہوا کہ امتحان کے موقع پر نہ عقل کام آتی ہے نہ پہلوانی۔ بلکہ حافظہ کی بہت سخت ضرورت ہوتی ہے ــــــ اچھا طالب علم کلاس میں وہی مانا جاتا ہے جو مکمل طوطا ہو۔ غرض امتحان کی ٹیکنیک سمجھنے کے بعد ہی رستم نے کلاس کو خدا حافظ کہا۔ اور حاضریوں کی پرواہ نہ کرتے ہوئے عقل و پہلوانی کو طاق پر رکھ کر بتائی ہوئی چیزوں کی رٹائی میں مصروف ہو گیا۔

ساتویں منزل
امتحان کے میدان میں

چونکہ رستم کی حاضریاں کم ہو گئی تھیں اس لیے وہ امتحان دینے سے روک دیا گیا۔ اس پر رستم بے حد پریشان ہوا۔ مگر سہراب نے کہا۔ "ابا جان اس میں گھبرانے کی کون سی بات ہے ــــــ حاضری کم ہونا تو فطری عمل ہے حاضریاں تو ٹھیک ہو سکتی ہیں۔ مگر اس کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہے۔" رستم نے پوچھا۔ "وہ کیا؟" اس نے کہا ــــــ "ایک تو تھوڑے سے مکھن کی ضرورت ہے۔ اور دوسرے پیسے کی۔" رستم نے کہا کچھ پرواہ نہیں۔ تم فوراً دونوں چیزیں بازار سے لے آؤ۔ سہراب بولا۔ "یہ جنس بازار میں نہیں مل سکتی۔" رستم نے پوچھا۔ پھر یہ کیا چیز ہوتی ہے جو ضروری بھی ہے اور بازار میں بھی نہیں ملتی۔" سہراب نے کہا۔ "ابا جان اس کے جاننے کی کوشش نہ کیجئے ورنہ مصیبت ہو جائے گی۔ امتحان پر طرت آپ کچھ

پکڑ کر منسٹر بنا دیا جائے گا۔" رستم نے کہا۔ "ہم کیا کریں گے منسٹر ہو کر، ہمارے خود بہت سے منسٹر ہیں۔" سہراب نے کہا ـــــ "اچھا آپ یہ کیجئے کہ جا کر ہیڈ ماسٹر صاحب اور دوسرے ماسٹر صاحبان کو صرف سلام کر آئیے اور یہ ظاہر کیجئے گا کہ میں آپ سے ملنے کا عرصہ سے مشتاق تھا۔ اور ذرا ٹھنڈا پانی چڑھا کر اوپر اٹھا دیجئے گا۔ جب تک میں یہاں کے حلقۂ ارباب حل و عقد یہاں کے حکام، وزراء جن سے میرے تعلقات ہیں اثر ڈال کر فون کرتا ہوں۔" رستم کی سمجھ میں آ گیا۔ غرض دن بھر کی دوڑ دھوپ کے بعد امتحان میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔ گو کہ رستم نے بنی بنائی بات بگاڑ دی تھی۔ اس نے ہیڈ ماسٹر صاحب سے جا کر کہا۔ "میں آپ کے مکھن لگانے آیا ہوں۔ یہ کہہ کر جیب سے مکھن کا ڈبہ اور چھری نکالی۔ اور ان سے کہا کہ آپ پانی پی لیجئے ذرا آپ کو قدرے اونچا اٹھا کر آپ کی بے حد تعریف کر دوں گا۔ ـــــ اتنی کہ آپ مجھے امتحان میں بیٹھنے کی اجازت دے دیں گے۔ ـــــ یہ سن کر ہیڈ ماسٹر صاحب سمجھے کہ رستم کا دماغ کچھ چل گیا ہے۔ اور وہ اسے کچھ سمجھانے بجھانے لگے۔ اور نرم گرم پڑ کر اس کا رد عمل رستم پر دیکھ ہی رہے تھے کہ انسپکٹر صاحب کا فون آ گیا۔ حکم حاکم اور رستم کو امتحان میں داخلے کا فارم مل گیا اور وہ اپنے رستم ہال واپس چل دیا۔ ـــــ کیونکہ ابھی دو دن باقی تھے اس لیے اس نے کمرہ بند کر کے دن رات پڑھنا شروع کر دیا۔ پڑھائی سے پہلے اس نے ایک نجومی کو پھر ہاتھ دکھایا۔ نجومی نے اسے بتایا کہ "پاس تو ہو جاؤ گے مگر امتحان سے پہلے اور امتحان کے بعد بڑی محنت اور دوڑ دھوپ کرنا پڑے گی۔

امتحان سے ایک دن پہلے وہ سہراب کو ساتھ لے کر اپنی سیٹ تلاش کرنے گیا۔ مگر چونکہ وہ نگراں کی میز کے بالکل سامنے تھی اس لیے رستم نے اسے ہٹانا چاہا۔

مگر وہ زمین میں جڑی ہوئی تھی۔ اس لیے دونوں باپ بیٹوں نے اسے پکڑ کر جو جنبش دی تو میز زمین نے چھوڑ دی۔ اسے سب سے کونے میں پیچھے رکھا گیا۔ جگہ نہایت مناسب تجویز کی گئی۔ اور کونے والی میز کو نگراں کی میز کے سامنے رکھ کر فرش برابر کر دیا۔ رستم نے اپنی میز کو اطمینان سے دیکھا اور سہراب نے کہا۔ "ٹھیک ہے ابا جان۔ یہاں سے آپ کو نقل میں آسانی رہے گی۔" شب میں پڑھنے سے قبل رستم نے عبادت کی اور گڑگڑا کر اپنے پالنے والے کے حضور میں رو دیا کہ "میں نے اے بار الہا بڑے بڑے میدان سر کیے۔ اب مجھے امتحان کے میدان میں بھی فتح نصیب کر۔" اس کے بعد اس نے سیمرغ کو یاد کیا۔ فوراً اسے خواب آیا۔ دیکھا کہ ہاتھی سے بزرگ، تر سیمرغ اس کے پاس آئے ہیں۔ رستم نے صاحب سلامت کرنے کے بعد پوچھا ـــــــ "بتلایئے امتحان میں کیا آ رہا ہے؟" انھوں نے کہا ـــــــ "پریشان ہونے کی کیا بات ہے۔ جب میں تمھاری ہر مصیبت میں کام آیا تو اس میں بھی کچھ نہ کچھ کروں گا ـــــــ" رستم بولا۔ ـــــــ "اور کچھ نہ کیجیے تو کم از کم 'گیس' ہی کر دیجیے۔ کہ کون کون سے سوالات امتحان میں آ سکتے ہیں۔ ـــــــ" سیمرغ نے کہا ـــــــ "ایک تو ہیڈ ماسٹر صاحب کے بھتیجے کے جو گیس پیپر چھپے ہیں، ان میں جو سوال پار سال آ چکے ہیں ان کو چھوڑ کر باقی کو چھوٹی چھوٹی پرچیوں پر نقل کر لو۔ دوسرے جو سوالات ماسٹر صاحب نے ظاہر کر دیے ہیں۔ ان کے جوابات لکھ لو۔" رستم نے کہا۔ "مجھے ہندوستان کا نقشہ بنانا نہیں آتا۔" سیمرغ نے ترکیب بتائی۔ "ہندوستان کا بنا بنایا خاکہ لے کر اس کے ہر خط پر کوئلے سے موٹی موٹی لکیر بنا دو جیسے ہی امتحان میں کاپی ملے۔ ڈسک میں سے خاکہ نکال کر کاپی میں رکھ کر کاپی کو ہاتھ سے دباؤ۔ کوئلے کا نقش ابھر آئے گا۔ پھر خاکہ کو گولی بنا کر

سوائے نگراں کے سمت کے کسی بھی جانب احتیاط سے لڑھکا دو ــــ اور کرکٹ کے نقش پر سیاہ روشنائی پھیر کر ٹھیک کر لو۔ اور اپنے گرز کو نیچے سے کھول کر اس میں جملہ سامانِ نقل، پرچیاں، خاکے، کتابیں۔ کلاس نوٹس۔ سالوڈ پیپرز وغیرہ رکھ کر گرز بند کر لو اور احتیاطاً گرز کو ساتھ رکھ لو تاکہ کام آئے۔" رستم نے کہا۔ "محترم بزرگ اگر پرچہ بالکل جنرل آجائے تو؟" سیمرغ نے کہا ــــ "تو یہ کرو کہ احتیاطاً سہراب باہر موجود رہے۔ جب کسی جواب کی ضرورت ہو، تم باہر لیٹرین رفاہ حاجت کے لیے آجانا، سہراب وہاں موجود ہوگا ــــ" اتنا بتا کر بزرگ سیمرغ غائب ہو گئے۔ رستم نے سہراب کے ساتھ رات بھر نقل کے لیے پرچیاں تیار کیں، اُن کو گرز کے اندر سلسلہ وار رکھا۔ احتیاطاً کچھ کتابیں اور کاپیاں بھی رکھ لیں۔ اور سہراب کو نقل کی تکنیک سے آگاہ کیا۔ وہ بولا ــــ "اس میں ابا جان کون سی انوکھی بات ہے۔ میں نے کون سے پاپڑ بیلے تھے۔ پڑھنے کون آتا ہے، سب یہی کرتے ہیں۔ تین گھنٹے میں قابلیت کا امتحان تھوڑی ہو سکتا ہے، ــــ کسی کے منھ پر تھوڑی لکھا ہوتا ہے کہ اس نے سال بھر پڑھا لکھا ہے یا نہیں، ممتحن کو تو سوالات کے جوابات صحیح ملنا چاہئیں ــــ" غرض سہراب کے اطمینان دلانے پر رستم مطمئن ہو گیا۔ یہ رات ان دونوں نے چائے پی پی کر پرچیاں بنانے میں گذاری۔ صبح رستم نے اُٹھ کر غسل کیا، عبادت کی۔ پھر رخش پر سوار ہو کر امتحان دینے چل دیا۔ راستہ میں جتنے فقیر ملے اُن میں رستم نے خلافِ توقع پرانے پیسے مفت تقسیم کیے۔ ایک بزرگ کے مزار پر پاس ہونے کی دعا مانگی۔ ایک مسجد کی دیوار چوم لی۔ ایک مندر کے سامنے جھک کر سلام کیا۔ جب گرجا پڑا تو وہ تعظیماً اتر پڑا ــــ

غرض رستم اپنے اسکول پہونچا ______ چونکہ کئی اور اسکولوں کے لڑکے بھی یہاں امتحان دینے آئے تھے اس لیے بڑی بھیڑ بھاڑ اور رونق تھی۔ اپنے اسکول کے لیے تو اب وہ ایک عام چیز ہوچکا تھا۔ مگر دوسرے اسکول والوں کے لیے ایک معمہ ہو گیا۔ دیکھتے دیکھتے بھیڑ لگ گئی، لڑکوں نے اس کے دستخط حاصل کرنے کے لیے ______ نوٹ اور آٹوگراف بک پیش کیں ______ دو ایک نے رستم کے ساتھ اپنی تصویریں بھی کھینچی۔ رستم نے ایک آٹوگراف بک پر لکھا۔ "تندرستی ہزار نعمت ہے"۔ مگر فوراً ہی وہ یہ سب چھوڑ چھاڑ کر اپنے درجہ میں داخل ہو گیا۔ کیونکہ نقل کی تیاریوں کے سبب وہ تنہائی چاہتا تھا۔ پہلا پرچہ اچھا ہوا، سب سوالوں کے جواب رستم کے گرز نے دیئے، اسے یہ بھی تجربہ ہوا کہ زمائی، نقل اور پوچھ کچھ کے علاوہ قیاس آرائی بھی بڑے نمبر دلوا سکتی ہے۔ دوسرے دن ہندی کا پرچہ تھا، جس میں گرز بھی زیادہ کام نہ کیا۔ تیسرے دن دو سوالوں کے جواب تو رستم کے گرز نے دیئے اور دو سہراب نے حل کر دیئے۔ ایک سوال بالکل جنرل آیا۔ "اگر بس والے سے آپ تین آنے کے دو ٹکٹ خریدیں اور اسے چونی دیں تو وہ آپ کو تین ہی پیسے واپس کرے گا۔ بتائیے ایک پیسہ کون لے گیا؟" رستم نے جواب میں لکھا۔ "ایک پیسہ کوئی بھی لے جاتا ہو۔ مگر ہم نہیں لے جانے کا ارادہ رکھتے ہیں۔" اس دن کا پرچہ اتنا اچھا ہو گیا کہ رستم نے سوچا، باقی پرچے بھی اتنے ہی اچھے ہو جائیں تو میں فرسٹ آجاؤں گا۔

چوتھے دن رستم کو پرچہ ترتیب دیتے وقت نیند آنے لگی۔ اس کا سبب اس کی امتحان میں جنگی پیمانے پر مصروفیت تھی۔ ان ہنگامی حالات میں سونے کا موقع ہی نہ ملتا تھا۔ اس دن ایک نوجوان نگراں بڑی مستعدی سے گشت کر رہا تھا۔ اب تک ایک پنڈت جی

رہتے تھے جو اخبار منہ پر رکھ کر خراٹوں کی مشق کرتے تھے۔ مگر آج ان کی جگہ جو حضرت آئے تھے۔ انھوں نے رستم کو نقل کرتے پکڑ لیا اور گریبان کے اندر سے کتابیں، کاپیاں، پرچیاں، سب کچھ برآمد کرلیں۔ مگر شرافت اتنی برتی کہ کاپی لے لی اور ان کو کلاس سے نکال دیا۔ وقت کی بات تھی کہ رستم سب کچھ برداشت کرگیا۔ اس پر بھی جو کچھ اس نے نقل کرلیا تھا وہ پاس ہونے کے لیے ناکافی تھا۔ سہراب نے کوشش کرکے خطا معاف کروادی۔ اتفاق سے دوسرے دن اس کی جگہ دوسرے نگراں آئے۔ فارسی کا پرچہ تھا جس میں نقل بھی کی جاتی تو آخر کیا۔ رستم پرچیاں احتیاطاً ڈھال میں چھپاکر لایا تھا اور نسبتاً زیادہ محتاط تھا۔ "جنگ رستم و اسفندیار بیان کرو۔" اس سوال سے رستم بے حد خوش ہوا۔ اس نے صرف دو گھنٹے اس سوال پر لگادیئے ـــــ دوسرا سوال تھا۔ "رستم کے خاندانی حالات بیان کرو۔" جنگِ رستم و سہراب پر ایک نوٹ لکھو؟"۔ اس سوال پر رستم بجد برہم ہوا کہ میری پرائیویٹ زندگی کے بارے میں کیوں سوال کیا گیا۔ دوسرے، اگر سہراب سے وہ اس کا جواب طلب کرتا تو تعلقات اور امتحان دونوں پر اس کا برا اثر پڑتا ـــــ اس نے اس کا بڑا اسمارٹ جواب لکھا۔ تیسرا سوال تھا۔ "رستم کی موت کے اسباب پر روشنی ڈالو ـــــ" اس پر وہ آپے سے باہر ہوگیا۔ یہ بھی ستم ہے کہ مجھ سے میری موت کے بارے میں جواب طلب کیا جارہا ہے۔ غرض پورے تین گھنٹے تک اس نے کاپی میں ان سوالات کے خلاف جنگ کی۔ بڑی پریشانی یہ تھی کہ جو کچھ فارسی پوچھی گئی تھی وہ اس نے کبھی خواب میں ایران میں بھی نہ بولی تھی اور نہ سنی تھی۔ سہراب بگڑ اٹھی کہ آپ کو صحیح جھوٹ سے کیا مطلب؟ کتابوں میں لکھا ہے یا پرچیوں میں وہی آپ کو لکھنا چاہیے یا کچھ

دن اردو ادب کا پرچہ تھا۔ رستم نقل کے ہتھیاروں سے پوری طرح لیس ہو کر پہونچا۔ ایک سوال تھا۔ "اردو کی کہانی کس نے لکھی ہے؟" رستم نے بہت غور کیا، جب اسے یقین ہو گیا تو اس نے لکھا۔ "مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ اردو کی کہانی میں نے ہی لکھی ہے۔" پھر تھا۔ "اس کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کرو۔" اس نے لکھا۔ "میں اپنے خیالات کا اظہار اگلے سوالوں میں کروں گا۔ ملاحظہ ہوں اگلے جوابات۔" ایک سوال تھا۔ "تنقید کیا ہے؟ ادب کیا ہے؟" اس سوال کا جواب بڑے جی جان سے دیا اور اس کی ڈھال اس موقع پر آڑے آئی ـــــ ایک سوال تھا۔ "موازنۂ انجام دستر دو کرد" رستم نے لکھا۔ "یہ بھی کوئی پوچھنے کی بات ہے اس کو تو سن تیلی کے ذریعہ بھی طے کیا جا سکتا ہے۔ پھر بلا ممتحن حضرات کے رجحانات معلوم کیے کیسے کچھ عرض کیا جا سکتا ہے۔ ویسے مجھے آپ کی رائے سے قطعی اتفاق ہو گا۔ بشرطیکہ نمبر دینے میں بخل سے کام نہ لیا جائے ورنہ میری رائے محفوظ سمجھی جائے ـــــ"

امتحان ختم ہوتے ہی سہراب نے کہا۔ اب دوڑ دھوپ کے لیے تیار ہو جائیے۔ میں نے پتہ لگا لیا ہے کہ کون کاپی کس کے پاس گئی ہے۔ مختلف شہروں کی خاک چھاننے کے بعد معلوم ہوا کہ صرف فارسی اور ہندی میں گڑبڑ ہے۔ باقی سب خیریت۔ رستم نے جو کچھ سال بھر پڑھا تھا اس دوڑ دھوپ میں وہ بھی بھول گیا۔ سہراب مطمئن تھا کہ گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ ایک ہی کاپی پر کم اور زیادہ نمبر مل سکتے ہیں۔ یہ جانچنے والے کے موڈ پر ہے۔ ہندی کے سلسلے میں بریلی جانا پڑا اور بات بن گئی۔ اور فارسی کے لیے آگرے روانہ ہوئے۔ جب ممتحن کو معلوم ہوا کہ یہ رستم ہیں۔ اور فر فر فارسی بولتے ہیں تو اس نے ان کو پاس کر دیا۔ گر اسے بے حد تعجب ہوا کہ ڈھونے والے پاس اور جاننے والا فیل ـــــ وہ انہیں تاریخ محل

دکھانے لے گئے ـــــ جہاں اس کی آمد کے سلسلہ میں شہریوں نے ایک سپاس نامہ پیش کیا۔ اور اس سے درخواست کی گئی کہ "جنگ نہ ہونے پائے" کے محضر پر دستخط کر دے۔ بڑی مشکل سے رستم کی سمجھ میں آیا کہ جنگ بری چیز ہے۔ رستم نے دستخط کر کے نوٹ لکھ دیا کہ "تیر کمان اور گرز کی لڑائی بہادری کی لڑائی ہے" ـــــ "ٹینکوں اور راکٹوں کی لڑائی نہ ہونی چاہیے۔ یہ سراسر حماقت، بزدلی اور انسانیت سوز ہے۔"

ـــــ اسی دن سہراب نے اپنے اور رستم کے لیے چاند تک جانے والے پہلے جہاز میں روسی فرم کی معرفت دو سیٹیں ریزرو کر وائیں تاکہ گرمیوں کی چھٹیاں عیش و آرام سے گزر جائیں ـــــ جب یہ دونوں گھومتے گھامتے سیر و شکار کرتے ایران کی سرحد پر پہونچے تو شاہ کیکاؤس کے علاوہ افراسیاب کا بھی مبارکباد کا تار اس کے پاس یوم کی خوشی پر ملا جس میں افراسیاب نے لکھا تھا کہ میں نے ایران کے ساتھ "پنچ شیل" منظور کر لیا ہو دوسرے دن تین تار اور ملے۔ یوری گگارین فاتح خلاد، شرپا تین سنگھ فاتح ایورسٹ اور ہیلری، فاتح قطب جنوبی کی جانب سے۔ رستم فاتح امتحان' کو ان لوگوں نے اس کو دنیا کی چوتھی سب سے بڑی فتح "تسلیم کرتے ہوئے مبارکباد پیش کی تھی۔ تار پڑھ کر رستم نے ایک شعر پڑھا ؎

جاند کو چھونے کا قصہ، بھول ہی جانے کی بات
ہر سہانی آرزو اب تک ہے دیوانے کی بات

اسے سن کر سہراب بولا۔ "معاف کیجیے گا اباجان۔ اس موقع پر اس شعر کا کوئی تک نہیں تھا۔ آپ ہمیشہ اچھا خاصہ شعر بے موقع پڑھ کر شعر اور کہنے والے دونوں کا خون کر دیتے ہیں ـــــ"

غرض رستم سیستان واپس پہونچا. شاہ کیکاؤس، زال اور دیگر عہدہ داران فوج کے ساتھ استقبال کے لیے آیا. بڑی دھوم دھام سے جشن فتح منایا گیا. رستم نے اپنی پوری گرمیوں کی چھٹیاں سہراب کے ساتھ افراسیاب کی شکارگاہ میں سیر و شکار میں گزار دیں۔

غدر سن اُنیس سو ستاون کے اسباب

(ایک مورخ کے قلم سے - ۲ر مئی ۱۹۹۵ء)

غدر کے اسباب

غدر کی اطلاع سب کو پہلے سے تھی، نجومیوں نے پیشنگوئی اور لیڈروں نے تقریروں کے ذریعہ پہلے سے آگاہ کر دیا تھا حکومت کی جانب سے محکمۂ حفظ ماتقدم نے سروے ڈیپارٹمنٹ کی خدمات حاصل کر کے غدر کے طول و عرض کی پیمائش کا بھی انتظام کر لیا تھا۔ عام بے چینی لوگوں میں پہلے سے تھی اور کسی خاص بے چینی کا انتظار تھا۔ یوں چھوٹے چھوٹے غدر پہلے بھی ہو چکے تھے۔ مگر مورخ کی حیثیت سے ہم زیادہ سے زیادہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے زیر اہتمام منعقد کردہ غدر کے بعد سنہ ۲۰۴۲ء کے غدر کا نام لے سکتے ہیں۔ اگرچونکہ یہ غدر آپس میں کچھ تقسیم ہو کر رہ گیا تھا اس وجہ سے اس کی پوری تصویر ہمارے سامنے نہیں آنے پائی۔ پس ہم اس کو زیادہ سے زیادہ غدر بھوت کہہ سکتے ہیں۔

حکومت نے بطور حفظ ماتقدم بر وقت ڈگیاں پٹوائیں، اپیلیں کیں، لوگوں سے کہلوایا ــــــ جو غدر کا نام لے گا اس کو غدار قرار دیا جائے گا ــــــ" مگر لوگ ان سب باتوں سے متاثر نہ ہو سکے۔ ایوانِ حکومت نے حزب مخالف کی مخالفت کے باوجود یہ بل پاس کر دیا کہ ــــــ سن ستاون کے بجائے سن چھپن الف اور سن چھپن ب کر دیا جائے تاکہ نہ سن ستاون آئے اور نہ غدر ہو ــــــ" مگر مخالف جماعت نے اچانک انڈر گراؤنڈ ہو کر سن ستاون کے کیلنڈر چھپوا کر سارے ملک کے طول و عرض میں تقسیم کرا دیئے۔ لوگ پیشتر ہی سے بارود کی طرح پھٹنے کو تیار بیٹھے تھے، اول تو لوگ ملک آزاد کروانے پر کیا کم خفا تھے، پھر ملک غلط طریقے پر آزاد کیا گیا تھا، خواہ مخواہ ریاستیں اور زمینداریاں ضبط کر لی گئی تھیں۔ اگر ملک آزاد ہی کروانا تھا تو اتنی سی بات کے لیے انگریزوں سے ملک چھڑوانے کی کیا ضرورت تھی۔ پھر تقسیم بھی غلط ہوئی تھی۔ اس سلسلے میں کافی بخل سے کام لیا گیا تھا ــــــ

آزاد ہندوستان کے پہلے انگریز گورنر جنرل لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے ہندوستان سے رخصت ہوتے وقت جو پریس کانفرنس کی تھی اس میں پریس کے چند غیر ذمے دار نمائندوں نے جو سوالات کیے تھے ان سے عوام میں کافی برہمی اور انتشار کے آثار نمایاں ہو چلے تھے ــــــ قارئین کی دلچسپی کے لیے ہم اس کے کچھ اقتباس پیش کرتے ہیں ــــــ

"لارڈ صاحب۔ آپ تو جا ہی رہے ہیں، اب تو بتا دیجیے کہ غدر کس نے کروایا تھا ــــــ؟"

لارڈ صاحب نے منھ پھلا کر جواب دیا ــــــ "ہم نے غدر نہیں کرایا تھا ــــــ"

"آپ نے باغیوں کو گولی سے کیوں اُڑوایا تھا ——؟"

"باغیوں کو خود باغیوں نے مارا تھا یا گولیوں نے، یہ باغیوں اور گولیوں کا معاملہ ہے، ہم اس پر کوئی رائے نہیں دے سکتے ——"

"مگر آپ لوگوں نے جو قتل عام کروائے تھے ——؟"

"مثلاً ——"

"غدر —— جلیانوالہ باغ اور سن بیالیس وغیرہ ——"

"وہ تو برائے تنبیہہ چھوٹے اور ہلکے پھلکے لاٹھی چارج کروائے گئے تھے۔"

"اب دوبارہ آپ غدر کب کروا رہے ہیں ——؟"

"نہیں اب کے آپ کو کروانا پڑے گا ——"

"آپ دوبارہ واپس کب آ رہے ہیں ——؟" کسی نالائق نے سوال کیا۔ اور لارڈ صاحب کا موڈ خراب ہوگیا، انھوں نے اپنے ڈرائیور سے کہا —— "ہماری گاڑی آگے بڑھائی جائے ——" (اقتباس دلی کرانیکل)

اسباب بہت دنوں سے غدر نہیں ہوا تھا۔ لوگ خواہش مند تھے کہ اب غدر ہونا چاہیئے اسی وجہ سے وہ سن ستاون کا سنہری موقع ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ ملک میں ایک باقاعدہ غدر کی کمی شدت سے محسوس کی جارہی تھی۔ لوگوں کے منھ ۱۸۵۷ء کا خون لگ چکا تھا۔ بہت دنوں سے عوام کے ملوہ فساد کی حسرتوں کا خون ہورہا تھا۔ ساری اٹامک انرجی بڑے بڑے تعمیری منصوبوں پر فضول ضائع کی جارہی تھی۔ دنیا کے ہر ملک نے اپنی اپنی فوجوں کو زراعتی دستوں میں تبدیل کردیا تھا خصوصاً روس، انگلستان، جرمنی، امریکا اور ہندوستان میں بڑی بڑی آرڈی نینس فیکٹریاں

اور بم سازی کے کارخانوں کو صنعتی و زراعتی دستوں میں تبدیل کر دیا گیا تھا۔ ہر چیز کی ارزانی نا قدری کی حد تک بڑھ چکی تھی۔ بموں اور مہلک ہتھیاروں، ٹینکوں کی جگہ ٹریکٹر ڈھالے جا رہے تھے۔ جبکہ عوام چاہتے تھے کہ مزید ہیروشیما و ناگاساکی بنائے جائیں۔ ایٹم بم۔ ہائیڈروجن بم اور جراثیمی بم امن کمیٹیوں کی نگرانی میں سمندر کے سینوں میں برابر دفن کیے جا رہے تھے۔ عوام اس ملکی و قومی نقصان پر بہت برافروختہ تھے۔ وہ خفا تھے کہ حکومت منصوبے کیوں بناتی ہے۔ آخر صوبے کیوں نہیں بناتی۔ صوبوں کی از سر نو تشکیل و علاقائی زبانوں پر غدر نہ ہونے دینے کا الزام حکومت عوام اور عوام حکومت کے سر تھوپنا چاہتے تھے۔

انڈیا آفس لائبریری لندن، اور کولمبیا کمپنی کے ہز ماسٹرز وائس ریکارڈ سے پتہ چلتا ہے کہ "اگر بجائے گرانی کے گرانی الاؤنس برقرار رکھا جاتا۔ تو یہ نوبت نہ آنے پاتی ——— " اگر ملک کو بیرونی ممالک کی امداد کے ذریعہ گوادستان، سکھستان، ہوٹلستان، ناگستان، کشمیرستان، طفلستان اور قبرستان ایسے مجوزہ کم از کم پچیس حصوں میں تقسیم کر دیا جاتا تو نتائج اتنے ہولناک نہ ہونے پاتے ——— " (مولا بخش لائبریری پٹنہ کا ریکارڈ) غدر کے ذمہ دار سب سے زیادہ ملک کے مقتدر رسائل اور پبلشرز ہیں جنہوں نے غدر نمبر نکالنے کے لیے غدریہ حالات کو ہوا دی ——— " محکمہ موسم کی اطلاع کے مطابق غدر کا طوفان اپنے صحیح وقت پر آیا۔ غدر کا آنا ضروری تھا، اگر اس وقت غدر نہ آتا تو زلزلہ آتا ——— بقول سڑنی کاٹن ——— " زلزلے سے غدر ہمیشہ بہتر ہوتا ہے " ——— غدر کے صحیح حالات اور عینی مشاہدات کی نایابی کا سبب یہ ہے کہ غدر آتے ہی یا تو پردیس والے چھٹی لے کر اپنے اپنے گھروں کو چل دیے۔

یا گھر بیٹھ رہے۔ جو ہوش میں تھے بیہوش ہو گئے اور ہوش آنے پر غدر رفع ہو چکا تھا۔

ملک کے سیاست دانوں اور ادیبوں میں غدر ہونے اور نہ ہونے پر وسیع پیمانے پر مناظرے چھڑ گئے تھے، کچھ لوگ چاہتے تھے کہ غدر کا خالی استقبال کیا جائے اور اس کی شاندار جوبلی منائی جائے، غدر نمبر او غدر لڈے ہوں، یہ لوگ نرم جماعت سے تعلق رکھتے تھے۔ مگر اکثریت ان کے خلاف تھی جن کا تعلق گرم پارٹی سے تھا۔ یہ ماضی کا ماتم نہ پسند کرتے تھے اور خواہاں تھے کہ ان کے بزرگوں نے ۱۸۵۷ء میں غدر کی جس تقریب کی بنیاد ڈالی تھی اس کا جشن صد سالہ منائیں اور جیسا کہ فرنگیوں نے کیا تھا، انسانیت کی لاش پر فاتحہ پڑھیں تاکہ اس کا ایصالِ ثواب اُن کی روحوں کو پہونچ سکے۔ اور ابلیس اعظم انھیں اپنے جوارِ رحمت میں جگہ دے سکے۔ ماضی کی روایات کو زندہ رکھنے کے لیے ان سیئات کی تقلید اشد ضروری تھی۔

تاریخ آل احمد سرور، فیض احمد فیض اور سردار جعفری وغیرہ نے غدر کی تاریخ کہی

فیض ـــــ گلوں نے رنگ بھرا ہے بہار گذری ہے
کہ عندلیب غدر نغمہ بار گذری ہے

۲۲۷۴ ۱۱۰۳ ـ ء ۷۰ ۱۳ ھ

جعفری ـــــ تفنگ و تیغ کو بڑھ کر ذرا اسلامی دو
کہ سرخ پوش مرا غدر شہزادہ آیا

۱۹۵۷ء

لٹن لائبریری علی گڑھ (شعبۂ مخطوطات) کے پرانے کرم خوردہ نسخہ جات میں ہم کو ایک تاریخ پروفیسر آل احمد سرورکی لکھی ہوئی ملتی ہے۔

اے گل بتو خرسندم تو بوئے غدر داری

1956 A.D.

(بشکریہ لٹن لائبریری علی گڑھ)

شروعات غدر اچانک شروع ہو گیا، غدر صحیح وقت پر یعنی ۲۶ر جون ۱۹۵۶ء دن کے بارہ بجے شروع ہوا، ہم اس کے بارے میں بالکل دعوے سے نہیں کہہ سکتے کہ غدر پنجاب سے شروع ہوا یا یو، پی سے یا دونوں جگہ ساتھ ساتھ لیکن جو مواد دستیاب ہوا ہے اس سے یو، پی کا نمبر آگے معلوم ہوتا ہے۔ غدر کا اہتمام ہندوستان میں کیا گیا تھا۔ مگر برصغیر کے دوسرے ممالک، لنکا، افغانستان، اور نیپال، وغیرہ میں بھی پھیل گیا تھا۔ جیسا کہ تاریخی دستاویز سے ثابت ہوتا ہے۔ سب سے پہلے مرزا پور کی چھاونی میں مرزا بھویا کے گھر کے سامنے سے شروع ہوا۔ واقعہ یہ بیان کیا جاتا ہے کہ مسمی منگل پانڈے (کہ جن کے دادا منگل پانڈے جنھوں نے ۱۸۵۷ء میرٹھ چھاونی میں چربی لگے کارتوس استعمال کرنے سے انکار کر کے غدر کا آغاز کیا تھا) جب گورنمنٹ راشن ڈپو سے گیہوں لینے گیا تو دوکان دار نے اس کو گیہوں ایک روپیہ کے ڈھائی سیر کے عوض دس سیر اس کے پلے باندھنے کی کوشش کر کے اس کے سادہ و معصوم جذبات سے کھیلنے کی کوشش کی ——— اس نے لاکھ سمجھایا بھی ——— نہیں بھائی ہم روپے کے ڈھائی سیر ہمیشہ لے جاتے تھے ہم کو ڈھائی سیر دو ——— مگر دوکان دار نے جھگڑا کرتے ہوئے کہا۔

"ہم دس سیر سے ایک تولہ کم نہیں دے سکتے، کیونکہ یہ حکومت کا حکم ہے"

اس طرح دوکان دار نے سستا اور زیادہ سودا دینے کے فریب میں منگل پانڈے کے جذبات کو مشتعل کرنا چاہا تو وہ اور بھی مشتعل ہو گیا۔ شاید منگل پانڈے اس پر بھی صبر کر لیتا۔ مگر جب اس کو روپے کے چالیس آنے واپس لوٹانے کی کوشش کی گئی تو اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے غصے میں پاگل ہو کر تین چار کو وہیں ڈھیر کر دیا اور اپنا ریوالور بلند کر کے اعلان کر دیا ہم اس حکومت کا خاتمہ کر دیں گے جو اس قسم کے سستے سودے بازی کے ذریعہ سمجھوتہ کرنا چاہتی ہے"——

فوج و سپاہیوں نے منگل کا ساتھ دیا اور دیکھتے دیکھتے منگل کی اولاد منگل نے جنگل کے منگل میں دنگل برپا کر دیا—— چھاؤنی میں آگ لگا دی گئی، افسران کو گولی سے اڑا دیا گیا، اور دلّی چلو کا نعرہ بلند کر دیا گیا——

غدر ۱۸

انگریزوں کے اسباب باندھنے ہی کے وقت سے غدر کے اسباب پیدا ہو چلے تھے۔ جیسا کہ ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں۔ مرزا پید کی بغاوت اور دلّی چلو کے نعرے نے پورے ملک میں بغاوت کی آگ پھیلا دی۔ سب سے پہلے کشمیر کے بحری بیڑے نے اپنے باغی ہونے کی اطلاع بذریعہ تار وزیر حرب اور وزیر اعظم کو دی۔ حکومت کے ذمہ داروں نے باغیوں میں نظم و نسق برقرار رکھنے کی خاطر اُن کی قیادت اپنے ہاتھوں میں لے لی۔ اور دلّی میں اُن کے استقبال کے لیے آل پارٹیز غدر کنونشن کی ایکشن کمیٹی نے ملک بھر کی تمام غدر یونٹس سے بذریعہ ریڈیو غدر کے کامیاب بنانے کی اپیل کی۔ چھوٹی بڑی تعداد میں باغیوں کے دستے دلّی کی طرف بڑھنے لگے ساری خلقت دلّی کی طرف ٹوٹ پڑی۔ روزانہ شام کو وزیر اعظم لال قلعے کی برجیوں پر کھڑے ہو کر دوربین سے باغیوں

کا تماشہ دیکھتے۔ خود انھوں نے باغیوں کو سلامتی امن اور coexistence کا پیغام بھیجا جو آج تک لال قلعے کے تاریخی میوزیم کے اندر میموریل کارنر میں محفوظ ہے۔ مگر میموریل کارنر اکالیوں اور مرہٹوں کی یورش میں تباہ ہوگیا۔ امن کے پیغام نے مجاہدین کے سینوں میں آگ لگا دی۔ ویسے بھی برابر اطراف و جوانب سے خبریں آرہی تھیں کہ باغی امن کمیٹیوں کے دفاتر، تعلیمی درس گاہوں، ہسپتالوں، ریڈ کراس اور دوسرے سماجی اداروں میں آگ لگا اور تاپ رہے ہیں۔

حالات حالات بہت نازک تھے۔ تمام فوجیں اور صوبے خود مختار ہو کر باغیوں میں شامل ہو گئے تھے، ہر طرف بدامنی اور طوائف الملوکی کا دور دورہ تھا۔ خوف و دہشت کا یہ عالم تھا کہ مائیں اپنے جوان جوان کلیجے کے ٹکڑوں کو گھروں میں اپنے سینوں سے لگائے بیٹھی تھیں۔ اگر وہ ذرا بازار میں سودا سلف خریدنے بھی نکلتے تو انھیں فوراً "دفاتر کے ڈائرکٹر" اور کمپنیوں کے منیجر زبردستی پکڑ لیتے۔

"چلیے، چل کر برماشیل کے منیجر ہو جائیے۔ ہم آپ کو چھ ہزار ماہانہ تنخواہ دیں گے" ــــــ اب وہ لاکھ خوشامد کر رہا ہے اور کہہ رہا ہے ــــــ "بھیا میں تو اپنی ماں کے لیے بازار سے دو پیسے کے پان لینے آیا تھا۔ اگر تم نے مجھے لے جا کر برماشیل کا منیجر بنا دیا تو اماں کو پان لے جا کر کون دے گا۔ آسمان کے فرشتے یا زمین کے بھوت ــ پھر میں تو صرف میٹرک پاس ہوں، مجھے تو ساٹھ روپے کی کلرکی چاہیے ہے، کلرکی، مجھے اتنا بڑا آفیسر نہیں بننا ہے ــــــ" اور تیل والے ہنستے پھر خوشامدانہ لہجہ میں کہتے ــــــ "ارے ہم تو صرف آپ کو منیجر بنا رہے ہیں۔ آپ ہم سے کچھ زیادہ تو مانگ کر دیکھیے ــــــ آخر آپ تیل کا کام کر کے تیلی ہی تو

رہیں گے۔ پھر ہمارا کام تو صرف آٹھویں پاس سے بھی چل جاتا، آپ تو میٹرک ہیں میٹرک ——
ہمیں آپ کا شکر گزار ہونا چاہیے کہ آپ کے تیلی ہو جانے سے آپ کی ذات والا صفات پر
جو اثر پڑے گا آپ بلا اس کا لحاظ کیے ہمارا کام کریں گے" —— مگر نوجوان رو رہا تھا۔

—— نہیں نہیں —— خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو —— مجھے جانے دو ——
میں کلرک پیدا ہوا ہوں، مجھے کلرک ہی رہنے دو ظالمو —— مجھ سے میری کلرکی نہ چھینو
—— مجھ پہ رحم کرو رحم ——" اگر باجی بر وقت انھیں بچا نہ لیتے تو ان کو
کمپنی یا دفتر والے زبردستی کام دلانے پکڑ کر لے جاتے۔ روز گار کا ہوا لوگوں پر اس بُری
طرح سوار تھا کہ وہ سر شام ہی اندر سے اپنے گھروں کے کواڑ بند کر بیٹھ رہتے۔ اگر
مجبوراً یا بھولے بھٹکے کوئی دن میں بازار کی طرف نکل جاتا تو دو کاندار منوں غلہ
کپڑوں کے تھان کے تھان۔ ہر قسم کی ضروریات و آسائشِ زندگی۔ بے انتہا
روزگاری و نوٹ اس کے سر منڈھ دیتے ——

شادی بیاہ اور روزگار کا یہ عالم تھا کہ سرکاری گرگے ہر طرف برابر تاک میں
لگے رہتے۔ اگر مخبری ہو جاتی کہ فلاں شخص، اس کا لڑکا یا خاندان میں دور دراز میں کوئی
بے روزگار یا کنوارا ہے یا اس کے پاس صرف ایک مکان ہے یا محض ایک نوکری یا ایک
بیوی ہے تو زبردستی سرکاری طور پر اس کا اغوا کر کے اس کو نوکریوں اور چھوکریوں سے لاد دیا
جاتا۔ اور جبراً قہراً کسی کسی کو کھیتوں اور بنگلوں کا مالک بننا پڑتا۔ لوگ اپنی اپنی مصیبتوں اور
پریشانیوں سے نجات پانے کے لیے جنگلوں کی طرف نکل بھاگے۔ بیچارے کنوارے اگر
عیاشی کے لیے جنگلوں کا رخ کرتے تو انھیں اس سلسلے میں بڑی مایوسی ہوتی۔ کیونکہ تمام
طوائفیں تیرتھ یاترا وغیرہ کے لیے چل دی تھیں۔ یا خیر سگالی وفد لے کر ممالک غیر

میں اپنے اپنے ملکوں کی نمائندگی کرنے کو سدھار چکی تھیں۔

ظلم و ستم کی حد یہ تھی کہ عوام طوق گلے میں ڈالنا چاہتے تھے اور حکومت اُن کے گلے میں بالیاں باندھنا چاہتی تھی۔

ملک میں لیڈروں کا پتہ نہ تھا۔ بڑی مشکل سے باغیوں کو پتہ لگا کہ اجمیر میں ایک لیڈر موجود ہے۔ باغی بڑی بھاری تعداد میں اس کی زیارت کو جمع ہوئے اور اس کی زندگی میں اس کا بڑا شاندار عرس دھوم دھام سے کروائی۔ پھر اسے عجائب گھر میں محفوظ کرکے اس پر ٹکٹ لگا دیا۔ تعلیم کا یہ عالم تھا کہ لوگ جبراً بڑی بڑی جماعتوں میں پڑھنے کے لیے بھیج دیے جاتے تھے۔ مقابلے کے امتحانوں کا سال بھر برابر اشتہار نکلتا رہتا۔ آخر میں مجبور ہو کر حکومت باغیوں سے چھپ کر آبادیوں میں دھاوے مارتی اور تعلیم یافتہ نوجوانوں کو اغوا کر لیتی۔ سرکاری سپاہی ان اغوا شدگان کو امتحانات کے ہال میں لے جا کر بند کر دیتے۔ کامیاب ہونے کے لیے صرف امتحان میں شرکت ضروری ہوتی۔ اگر کوئی رشوت یا پگڑی دینے کی کوشش کرتا تو افسران اسے مجھ نہ پاتے۔ آخر میں باغیوں کا زور اتنا بڑھ گیا اور لوگ نوکری کرنے سے بغیر کسی بھاڈے راضی نہ ہوتے تو حکومت نے مجبوراً نجومیوں اور رمالوں کو پیش کش کی وہ اپنے علم و عمل سے ایسے لوگوں کے نام اور پتے بتائیں جو بھالے کام آ سکیں۔ نجومیوں کی نشاندہی پر حکومت کے چھاپہ مار دستے کلرکوں اور پٹاری تانزموں تک کو اعلیٰ عہدوں پر تعینات کرنے کے لیے ان کے گھروں سے برآمد کرتے۔ اکثر اس سلسلے میں باغیوں اور چھاپہ مار دستوں میں بڑی سخت جنگ بھی ہوتی۔

عدالتوں کو گواہ نہ ملتے۔ لوگ ڈر کے مارے گواہی دینے نہ آتے کہ کہیں اسی بہانے

بلوا کرہم کو سرکاری افسر یا وزیر نہ بنا دیا جائے۔

ڈگریاں ترکاری کی طرح سڑکوں پہ اس طرح بکتیں جس طرح آٹا لوگ دوا میں بیچتے ہیں۔ سوائے چند دیہاتیوں کے جو گھر سجانے کے لیے لے جاتے۔ بقیہ انھیں آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتے۔ یا معصوم بچے پتنگیں بنا کر اڑاتے۔ حکومت نے باغیوں کے سامنے بارہا پیشکش بھی کی کہ ـــــ "ہم تنخواہیں اور بونس بڑھادیں گے، تعلیم اور سستی کردیں گے، عقل سے کام لیں گے، نوکریاں عام کردیں گے، ٹیکس معقول کردیں گے ـــــ" مگر باغی یہ سب چاہتے ہی نہ تھے۔ ان باتوں سے وہ اور بھی مشتعل ہو جاتے ـــــ

باغیوں کا راج یہ رپورٹ جانچ کر لیے، برکار اور دانشوری پہ سارکی کی سند سے یہ بات پایۂ ثبوت تک پہونچ چکی ہے کہ دلی پہ باغیوں کا قبضہ ڈھائی دن اور تین گھڑی رہا۔

لوٹ مار و قتل عام باغیوں نے امن کمیٹیوں، ہسپتالوں، تعلیم گاہوں، ریڈ کراس کے دفاتر، منصوبے بنانے والے مرکز، ٹڈی مارنے والے جہازوں، آگ بجھانے والے انجنوں، دفتر روزگار، اور اناج دلانے والے دفتروں، حفاظتی چوکیوں، پانی گھروں، بجلی گھروں اور صنعتی و زراعتی کارخانوں کو خوب لوٹا۔ انھیں جو بھی رہبری یا کام کرتا ملا اسے انھوں نے سولی پہ چڑھا دیا۔

باغیوں میں پھوٹ عین اس وقت جب غدر اپنے نقطۂ انتہا پر پہونچ چکا تھا باغیوں میں پھوٹ پڑ گئی۔ اس کے بارے میں لوگ مختلف الرائے ہیں۔ کچھ کہتے ہیں کہ باغیوں نے پھوٹ کھائی تھی۔ مگر بقیہ کچھ اور سبب بتلاتے ہیں۔ یعنی یہ کہ لوگ غدر کی جوبلی منانا چاہتے تھے۔ انھوں نے لوٹ مار کو پسند نہیں کیا۔

اور حکومت سے جو فرار ہو کر اپنے موسم گرما کے پہاڑی دفاتر میں روپوش ہو گئی تھی۔ اور باغی ابھی ان بلندیوں تک نہ پہونچ سکے تھے انھوں نے حکومت سے خفیہ ساز باز کر لی۔ سازش کامیاب ہوئی۔ غدر کرنے والے رات کو خود اپنے ہی آدمیوں کے ہاتھوں گرفتار کر لیے گئے۔

واقعہ واقعہ ہوا کہ نرم پارٹی جو صرف جوبلی منانا اور غدر نمبر نکالنا چاہتی تھی گرم پارٹی سے جو غارت گری پر آمادہ تھی، سے الگ ہونے کے باوجود نظاہر ملی ہوئی تھی۔ اس نے جشن غدر منانے کے بہانے مٹھائی کے ٹوکروں میں اپنے سپاہی اور میگزین منگوا لیے اور رات کے پچھلے پہر ان مسلح سپاہیوں نے دلی دروازہ کھول دیا۔ حکومت کی فوجوں نے اچانک شبخون مارا جو کامیاب رہا۔ باغیوں کے تمام سرغنہ گرفتار کر لیے گئے۔ معمولی جھڑپوں کے بعد تمام باغیوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ اور عام معافی و امن دامان کی پیش کش کی۔

گرفتاریاں اور معافیاں عام باغیوں کو جرمانے ادا کرنے یا تا برخاست عدالت کی سزا دے کر چھوڑ دیا گیا۔ نابالغوں اور طالبعلموں کو شبہ کا فائدہ دیتے ہوئے سال سال بھر کے نیک چلنی اور ضمانت و مچلکے بھروا کر چھوڑ دیا گیا۔

مقدمے و سزائیں جن کو سزا دینا تھا اُن کو طویل و مختصر سزاؤں کا حکم سنا دیا گیا۔ پھر بھی باغیوں کی بڑی تعداد پر سختی کر کے انھیں رہا کر دیا گیا۔ اس کے بعد غدر کے قائدین پر مقدمہ چلانے کی تحریک ہوئی۔

تاریخی مقدمہ لال قلعے میں غدر کرنے والے باغیوں کے سرغنہ پر تاریخی مقدمہ

پیلایا گیا جس کی خصوصیت یہ تھی کہ اس کی کوئی تاریخ نہیں مقرر کی گئی تھی پھر بھی غالباً وہ سنیچر کا دن تھا۔ باغیوں کے بیانات شروع ہوئے۔ مجمع اس کثرت سے تھا کہ مجبوراً تماشائیوں پر ٹکٹ لگایا گیا، بالغ نصف اور نابالغ دوگنے دام ادا کر کے تماشائیوں کی گیلری میں بیٹھ سکتے تھے۔ پریس، وکلا، مجرمین، گواہان اور جیوری پر کوئی ٹکٹ نہیں لگایا گیا تھا جبراً اُن سے پیسے لے لیے گئے تھے۔

باغیوں کے بیانات اور سزائیں

سب سے پہلے باغیوں کے قائد منگل پانڈے کو کمرۂ عدالت میں پیش کیا گیا۔ ان کے برآمد ہوتے ہی مجمع قابو سے باہر ہو گیا۔ شیم شیم اور ہیرو ہیرو کے نعروں اور پھولوں و گندے انڈوں کی بارش میں منگل کو دوست و دشمن کی تمیز کرنا مشکل ہو گئی۔ مگر پھر بھی اس نے سب کا شکریہ ادا کیا کیونکہ مقدمہ لال قلعے کے فوجی کورٹ میں بصورت کورٹ مارشل ہوا تھا اس لیے مارشل نے منگل سے اس کا بیان حلفی شروع کرنے کا حکم دیا۔

مارشل ——— "تم کو اپنی صفائی میں کچھ کہنا ہے؟"

منگل ——— "صفائی کی ضرورت مجھے نہیں تم کو ہے ———"

"تم نے غدر کروادیا! کیا یہ الزام درست ہے ——— بولو ——— ؟"

"ہاں مجھے فخر ہے کہ میں نے غدر کروادیا ———"

"عدالت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ایسا کیوں ہوا ———"

"عدالت اس کے اسباب جانتی ہے ———"

"اور تم کو یہ بھی معلوم ہے کہ تم حکومت کے باغی ہو ———"

"ہاں مجھے اپنے باغی ہونے پر ناز ہے ———"

"اور بغاوت کی سزا کیا ہے۔ یہ بھی جانتے ہو"

"تمہاری سزاؤں کی جس کو پرواہ ہو وہ ان کو جاننے کی کوشش کرے۔ ننگلی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتا۔"

"حکومت تمہاری شکایات جاننا چاہتی ہے۔"

"کیا حکومت یہ جاننا چاہتی ہے کہ ننگلی باغی کیوں ہوا۔ کیا حکومت کو یہ علم نہیں ہے کہ اس نے روپیہ کے چالیس آنے اور ڈھائی سیر کے بجائے دس سیر کا اناج کر دیا۔ کیا حکومت نے ریاستیں اور زمینداریاں نہیں ضبط کیں۔ میں پوچھتا ہوں کہ حکومت نے اس کے لیے عوام کے نمائندوں سے بھی رائے لی تھی، ان کے جذبات کا بھی خیال کیا تھا۔ (عوام کے نعرے، شیم شیم اور عدالت کی آرڈر آرڈر کی صدائیں) کیا حکومت نے منصوبے نہیں بنائے۔ ہر پانچ سال بعد ایک منصوبہ، آخر کوئی حد بھی ہے اس تعمیر کی۔ اسے کوئی برداشت کر سکتا ہے۔ کیا آج مجھے گرفتار کرنے والے بتا سکیں گے کہ انھوں نے بے روزگاری کو کیوں ختم کر دیا۔ طوائفوں کو کیوں ختم کیا۔ کیا میں جھوٹ کہتا ہوں کہ ہمارے لیے تعلیم کو سستا اور آسان نہیں کیا گیا۔ پھر جب ہر چیز سستی اور ارزاں کر دی جائے گی تب ہماری نسل میں تلاش معاش و فاقہ مستی کا خمیر اور جستجو کا مادہ کہاں سے آئے گا۔ کیا حکومت کو علم نہیں کہ روزگار دلانے والے دفتروں نے ہمارے بیٹوں اور بیٹیوں کو زبردستی روزگار دلا کر ہمارے سینوں پر کدالی اور پھاوڑے دڑ بکڑ نہیں چلائے۔ ہماری معصوم حسرتوں نے ہمارے ناگاساکی اور ہیروشیما بنانے کے سنہرے خوابوں کو مسمار نہیں کیا۔

میں پوچھتا ہوں۔ کہاں ہیں وہ ارباب حکومت جو اس وقت انگریزوں کو ملک سے

نکال رہے تھے جنھوں نے ملک کی تقسیم کرتے وقت مقامی و علاقائی آزادیوں و خود مختاریوں کو ہمیشہ کے لیے ختم کر دیا۔ جنھوں نے اپنی حکومت اور طاقت کے گھمنڈ میں صوبائی و علاقائی و سیاسی تعصب اور متعصب جماعتوں کو ہمیشہ کے لیے موت کی نیند سلا دیا۔ میں کہتا ہوں کیا وہ ملک کے اور مزید حصے نہیں کر سکتے تھے۔ کیا ہمارے وزیروں اور لیڈروں نے اپنے پیٹ کاٹ کر اور پیدل دورے کر کے ہماری ناک دوسرے ممالک کے سامنے نیچی نہیں کی۔ انھوں نے اپنی تنخواہیں اور الاؤنس کم کرا کر کیا ہماری دلآزاری سلب نہیں کی۔ کیا اب بھی وہ ہمارے نمائندے رہ گئے۔ کیا وہ رشوتیں نہیں لے سکتے تھے، کیا وہ اپنی تنخواہیں نہیں بڑھا سکتے تھے۔ کیا ایسا کرتے انھیں شرم محسوس ہوتی تھی۔ کیا اسی دن کے لیے وہ ہم سے ووٹ مانگنے آئے تھے۔ کیا حکومت نے چوریوں، ڈاکوں اور بے ایمانیوں کو ختم کر کے جیل، پولیس اور عدالتوں کو مفلوج نہیں کر دیا۔ کیا جنگ نہ کرنے کے معاہدے نے ہماری فوجوں کو بے کار نہیں کیا۔ کیا فوجوں کا یہی کام ہے کہ وہ گھاس کاٹیں اور بجائے ٹینک کے ٹریکٹر چلائیں — کیا ان حالات کے ہوتے ہوئے بھی حکومت سمجھتی ہے کہ غدر نہ ہوتا۔ کیا یہ حالات غدر کرنے کے لیے کم تھے۔ کیا حکومت کو غدر کروانے کے لیے آسمان سے کسی قیامت کے نازل ہونے کا انتظار تھا۔"

تقریر کرتے کرتے نگل پانڈے شدت جذبات سے مغلوب ہو کر دم لینے کے لیے بیٹھ گیا۔ تماشائیوں میں نگل پانڈے کی جے جے کار ہونے لگی اور مارشل نے "کسٹم آرڈر" کی اپیل کے بعد حکم دیا۔

"چڑھا دو سولی پر اس باغی اور غدار کو — ہم اس کے لیے پھانسی

کی سزا تجویز کرتے ہیں۔ اور حکم دیتے ہیں کہ بقیہ باغیوں کا مقدمہ اگلی میٹنگ میں بند
کمرے میں چلایا جائے۔ ورنہ خطرہ ہے کہ دوبارہ یہ بغاوت کی چنگاریاں بھڑک کر
شعلوں میں نہ تبدیل ہو جائیں ــــــ" مارشل کے اس حکم اور جیمڈی کی اتفاق رائے
سے امر شہید ننگل کو سولی پر چڑھا دیا گیا۔ پھر نہ پتہ چلا کہ بقیہ باغی سرداروں کو زمین
کھا گئی یا آسمان ــــــ اب غدر کے چرچے رہ گئے ہیں ــــــ تاریخ کے
تسلسل کو برقرار رکھنے کے لیے ہمیں غدر کے بارے میں صرف اتنا ہی مواد ملتا ہے۔

کپور — ایک تحقیقی و تنقیدی مطالعہ

جو ادیب طنز نگار ہیں اُن میں سے ایک آدھ سے مجھے بار بار ملنے کی خواہش ہوتی ہے۔ ان ہی میں سے یہ حضرت کپور بھی ہیں۔ کپور کی گرفت مجھ پر اس وجہ سے ہے کہ یہ ایک مزاح نگار ایک طنز نگار ہیں۔ اور اس سب کے باوجود ایسے ہیں جیسے کہ عام طور پر ہم آپ ہوتے ہیں۔ تنقید میں لوگ کبھی انھیں اچھا کہتے ہیں، کبھی بُرا۔ مجھے یہ دونوں باتیں ناپسند ہیں۔ آرڈی نینس کسے پسند ہوتے ہیں۔ الٹی چیز سیدھی یا سیدھی الٹی نظر آئے تو کوئی تعجب کی بات نہیں مگر حیرت ضرور ہوتی ہے، کیونکہ طنز کا تقاضہ ہے وہ یک رنگی میں ظرافت اور ظرافت میں یک رنگی پیدا کرے۔ مگر مجھ سے پوچھا جائے کہ اردو ادب نے ہم کو کیا دیا تو میں یہ تین نام لوں گا۔ غالبؔ، اقبالؔ اور کپور۔ غالبؔ اور اقبالؔ کی خطا اس وقت معاف کیجیے اور کپور کی بات کیجیے۔ جو طنز نگار اپنے قاری کو اپنا ہمراز و دمساز نہ بنا سکے وہ طنز نگار نہیں، مولوی یا لیڈر ہوگا! خو جبل کر

دوسروں کو ہنساتے ہیں۔ کڑھنا اور ہنسانا وہ امتیاز ہے جو ان کے سوا کہیں نظر نہیں آتا زمانے نے طنز نگاروں کے ساتھ کبھی اچھا سلوک نہیں کیا۔ اس لیے کہ طنز نگار خود زمانے کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرتے۔ یہ بات ہمیشہ بھول جانی چاہیے۔ طنز نگاروں پر کبھی بھروسا نہیں کرنا چاہیے۔ مجھے یہاں وہ باتیں ثابت نہیں کرنی ہیں جو ابھی ابھی کہی گئی ہیں ان کے بہت سے مضامین ایسے ہیں جن پر خون خراب ہو سکتا ہے، خون زیادہ خراب کم۔ ایسے ہی مضامین پر میں سر دھنا کرتا ہوں، یہی تاثیر دلیری اور دلبری دونوں کا باعث ہوتی ہے۔ ان کا کارنامہ یہ ہے کہ انھوں نے طنز کو ہمارا کلچر اور ہمارے کلچر کو طنز بنا دیا۔ طنزیات و مضحکات میں طنز کا یہ "تصرف دوام" مبارک سمجھا جائے یا نہیں، حیرت انگیز ضرور ہے۔ انھوں نے طنز کی وضاحت کی ہے امامت کا دعویٰ نہیں کیا ہے۔ یہ وہی طنز نگار کر سکتا ہے جس کی گرفت زندگی پر ہو نہ کہ وہ جو زندگی یا طنز نگاری کی گرفت میں ہو۔ اس گرفت میں کپور ایسے آئے جیسے فلمی گانوں کے درمیان اور دوران میں پکے گانوں کا کوئی اُستاد وارد ہو جائے۔ کپور دو اور دو پانچ مانتے ہیں، ریاضی سے یہ لگاؤ دوسروں کو ناگوار ہو تو ہو مجھے گوارہ ہے۔"

(پروفیسر رشید احمد صدیقی)

"کپور کی طنز نگاری ہمارے ادب کے تہذیبی سرمائے کے اُس سماجی اظہار سے منسلک ہے جو معاشی و معاشرتی حالات اور میکانکی قوتِ نمو کے ارتقا کی جدوجہد، تخلیقی عمل اور جمود کے سماجی ٹکراؤ سے انفرادی لپندیدگی کی صورت میں برآمد ہوتا ہے اس کا عمرانی مفہوم میرے نقطۂ نظر کے فلسفیانہ ربط اور اشتراکی حقیقت نگاری کی طبقاتی

کشمکش کے اجتماعی شعور میں عام ہے۔ یہ ریاضیاتی تناسب اور مابعد الطبیعات کے لاشعوری تضاد کے بعد المشرقین میں مل جائے گی۔ کبھی کبھی یہ بُعد المغربین کی نامیاتی صورت میں بھی ظاہر ہوتی ہے۔ مگر اجتماعِ ضدّین ہر کسی نقطہ نظر سے قطعی غیر منطقی ہے کیونکہ اس کے مثبت و منفی اثرات اپنے سطحی مفہوم کی توضیح کے لیے مروّجہ عصری روایات کی مادیت، ہیئت، اور مواد کی گتھیوں میں اُلجھ کر رہ جاتے ہیں۔ اس کے ساتھ ہی تاریخی جبریت کی حقیقت پرستی جو ادب برائے زندگی کی ترویج میں زمان و مکان کو اپنی گرفت میں لاکر رجعت پرستی کا تاریخی تجزیہ کرتی ہے، تاریخی مادیت کے سماجی محرکات کی سطحی خارجیت کی داخلی کثافتوں سے آلودہ ہو کر اپنے مبہم مفہوم میں سماجی ڈھانچے کو پیش کرتی ہے۔ کیونکہ واقعیت کا جامد تصور اُن کے مزاحیہ نصب العین کی توجیہہ کر دیتا ہے۔ طنز و ظرافت کی یہی مادی کشمکش سماجی نظام کی حکیمانہ پیروڈی پیش کرتی ہے۔ اس سے سماجی پیچیدگیوں کے ما فوق الفطرت مسائل پر روشنی پڑتی ہے۔ اور بین الاقوامی بورژوا سماج کے مخصوص فلسفۂ حیات کی ذہنی کشمکش پرولتاری طبقے کے طبقاتی شعور کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔ حاکم اور محکوم کی یہ کشمکش اُن کے طنز کا نشانہ ہے۔"

(بہ طرز پروفیسر احتشام حسین)

---

* اردو میں طنز کا وجود محض فرضی ہے۔ یہ صفر کا نقطۂ خیال ہے۔ یا زیرے کی موہوم لکیر۔ اس طرز کے طنز اور صحیح ظرافت میں فرقِ مشرقین ہے۔ یہ فرق یہاں کم معلوم ہوتا ہو۔ مگر دوسروں کے مقابلے میں نسبتاً زیادہ ہے۔ یہ دلچسپ ضرور ہے لیکن اسے ظرافت سے

کوئی خاص لگاؤ نہیں۔ اس کے پیش کرنے سے طنز و ظرافت کی اہمیت میں اضافہ ممکن
نہیں۔ اس لحاظ سے یہ اوروں پہ فوقیت رکھتا ہے، دنیائے طنز میں اس کی وہی اہمیت
ہے جس کی حامل پطرس کی ظرافت ہے، یہ گویا مزاح کا بلند ترین نقطہ ہے اس سے آگے
فکر کی رسائی نہیں، اس محدود طاقت پہ پرواز کا ہونا نہ ہونا برابر ہے، تفصیل کی یہاں
نہ گنجائش ہے نہ ضرورت، نہ وقت، غالباً "یہ پطرس کو دیکھ کر میدان میں آئے، مگر
افسوس کہ ان میں پطرس کے محدود اوصاف کا بھی مطلق پتہ نہیں، ان کی کتابوں کے
دیباچے پڑھنا گویا جہاد کرنا ہے۔ لیکن اس جہاد سے بھی کوئی دینی یا دنیوی فائدہ مقصود
نہیں۔ کیونکہ ان کے خیالات ماخوذ، واقفیت محدود، نظر سطحی، تخیل ادنیٰ، علمیت
غائب، شخصیت اوسط، املا غلط، انشا غلط، یہ خود غلط، پھر کورانہ تقلید میں مثل
آفتاب روشن، اس کا خیال بھی نہیں ہوتا کہ ان سے اور روح طنز سے کوئی لگاؤ بھی
ہے، نظر حسب معمول جسم پہ ہے، دوسرے کی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ان کی عینک مانگے
کی ہے۔ آواز اپنی نہیں محض ایک صدائے بازگشت ہے۔ یہ آواز اردو طنز کی تکمیل ہے۔
یہاں جو کچھ لکھا جائے گا اس سے ان کی تحقیر مقصود نہیں، ان کی اہمیت اپنی جگہ پہ مسلم
ہے۔ یہاں صرف اتنا کہنا کافی ہوگا کہ ان کی نظر سطحی ہے۔ اسی وجہ سے ان کے قاری
کو ذہنی جمناسٹک کی ضرورت پڑتی ہے، مگر ان تمام باتوں کے باوجود کسی نے اب
تک "نرم گرم" سے بہتر کارنامہ پیش نہیں کیا، یہ خیال کہ "نرم گرم" اردو میں طنز و
ظرافت کا بہترین کارنامہ ہے۔ نہایت حوصلہ شکن ہے۔ جس کو یہ طنز کہتے ہیں اس کا
ظرافت سے دور کا بھی لگاؤ نہیں ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ طنز و ظرافت
کے زینے میں معلق ہیں، ان کی اہمیت باوجود قابل قدر اضافوں کے بہت زیادہ نہیں،

ان کی وقعت مشاعروں کے سبحان اللہ سے زیادہ نہیں۔ اس کا سبب ان کی مزاحیہ کجروی کے سوا کچھ نہیں، ان کی حیثیت ایک ایسے طالب علم کی ایسی ہے جن کی شخصیت ایسی ہے جیسی کہ عام طور پر شخصیت ہوا کرتی ہے جو ان کی قوتِ ایجاد کی کمی ظاہر کرتی ہے۔ ان کے مضامین پڑھنے کے لیے ایک عمر چاہیے۔ یہ ایک طالب علم کے کارنامے ہیں جو قابلِ رشک ہیں۔ یہ مضامین اتنے شگفتہ و دل بہار ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ مصنف اس کا اہل نہیں کیونکہ یہ عمرِ طبعی پر پہونچنے سے قبل ہی مصنف بن بیٹھے یہ مضامین اسی عجلت اور کم سنی کا نتیجہ ہیں۔ اس سے ان کی مزاحیہ بوکھلاہٹ کا پتہ چلتا ہے۔ اس قسم کی بوکھلاہٹ مصنف کو دلیر بنا دیتی ہے۔ اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے جس سے فرشتے لرزتے ہیں اور نقّاد قلم اٹھاتے ہیں۔"

(بہ طرز پروفیسر کلیم الدین احمد)

"مجھے ـــ یہ ـــ کہنا ہے ـــ کہ ـــ کپور ـــ کے مضامین میں جو وہ لکھتے ہیں وہ مضامین اور ان کے دوسرے مضامین جو طنزیہ و مزاحیہ ہوتے ہیں، ان مضامین میں میرے خیال میں جہاں تک میں نے ان کا تنقیدی تجزیہ کیا ہے اور میں جن نتائج پر بالترتیب پہونچا ہوں اُن سے صرف ایک ہی نتیجے پر پہونچا ہوں کہ یہ مضامین اپنی جگہ پر ایسے مضامین ہیں جن میں میری دانست میں طنز ہے یعنی ان مضامین میں طنز ہے ـــ طنز ـــ میں یہ کہتا ہوں کہ ان مضامین میں اپنی جگہ پر جیسا کہ لکھ چکا ہوں طنز ہے۔ ایسا طنز جو سودا، غالب، اکبر، رشید احمد صدیقی، فرحت اللہ بیگ، پطرس، شوکت تھانوی، سید محمد جعفری، شفیق الرحمٰن، غلام احمد

فرحت اور کنہیا لال کپور کے یہاں پایا جاتا ہے اور جس کی بے شمار مثالیں مغربی ادب سے پیش کی جا سکتی ہیں۔ مثلاً پوپ، سوئفٹ، لیوکاک، مارک ٹوین وغیرہ کے یہاں جابجا آپ کو ملے گا۔ اور قدم قدم پر ملے گا، یہی وہ طنز ہے جس سے کپور اپنے مضامین میں طنز کا احاطہ کرتے ہیں۔ یعنی اپنے مضامین میں طنز کو جگہ دیتے ہیں جس کی وجہ سے ان کے یہاں طنز آجاتا ہے، دوسرے معنوں میں یوں سمجھیے کہ پیدا ہو جاتا ہے۔ ایسا طنز جو دیکھنے میں عام طور پر طنز معلوم ہو اور جو کہ اپنی جگہ پر سوائے طنز کے اور کچھ نہ ہو۔ یہ بڑی اچھی بات ہو اور ہر جگہ اس بات کا ہونا مشکل ہے۔ مگر پھر بھی دھنوں نے اس مشکل کو بخوبی نبھا دیا ہے، نبھانا بھی ایک آرٹ ہے اور اس آرٹ میں مجھے طنز ملتا ہے طنز۔ لہٰذا اس سے یہ بات بخوبی واضح، ثابت اور روشن ہو کر صاف ہو جاتی ہے کہ ان کے یہاں قاری کے علاوہ ناقد کو بھی بہ آسانی طنز دستیاب ہو جاتا ہے۔ اس طنز کو جو ان کے یہاں ہے ہم سوائے طنز کے اور بھلا کہہ بھی کیا سکتے ہیں جو کہ طنز ہے یعنی طنز ہی ہے۔ اگر کچھ اور ہوتا تو بھی طنز ہوتا۔ طنز کا ہونا اس امر کی دلیل اور کھلی شہادت ہے کہ ان مضامین میں ہم کو طنز مل جاتا ہے۔ ابھی میں نے دلائل و شواہد سے اس بات کو واضح کیا ہے کہ طنز نگار کپور کے یہاں مجھے طنز ملتا ہے۔ جس میں ظرافت کی چاشنی، مغرب کے اثر سے آتی ہے اور بجنسہٖ موجود ہے جس کی وجہ سے میں یہ کہنے پر مجبور ہوں کہ ان کے یہاں جو چیز ہے وہ سوائے طنز کے اور کچھ نہیں ہو سکتی۔ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ یہ طنز ہے۔ یہ موقع تفصیل میں جانے اور بحث کو طول دینے کا نہیں، اس لیے مختصراً عرض کرتا ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے جس کے لیے قسم خدا کی میں اب حلف اٹھانے تک کو تیار ہوں کہ ان کے یہاں طنز ہے۔"

(بہ طرزِ ڈاکٹر عبادت بریلوی)

"اس مخطوطے کو اختلاط طباعت کی کثرت کی وجہ سے کالعدم سمجھا جائے اس لیے میں اس سے استشہاد نہیں کروں گا، اقتباس بالا صـ ۹۲ سطر ۲ خط جو میں نے اپنی خوش دامن کو تحریر کیا تھا۔ حاشیہ نمبر ۲ مجھے بانکی پور لائبریری میں ایک مخطوطہ دیمک زدہ اور سقیم حالت میں کچھ کے مضامین کا مل گیا ہے۔ خاندان میں جلبہ پر سانبہ حالی کو اس کی خوش خبری پہونچا دو کہ فی زمانہ اس سے جہاد میں مصروف ہوں۔ اندازہ ہے کہ اس کا تعلق بیسویں صدی کے نصف آخر سے ہے " جزئی باتوں سے قطع نظر ۱۲ کتابیں کے ۳۲ دفتروں میں ایک نسخہ اور بھی ناقص مقدمہ ۱۲۱ نہ ہونے کے برابر ہے۔ اگر اس کو تسلیم نہ کیا جائے تو مصنف کے ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ حاشیہ "دھوبی کی کاپی" صفحہ، سطرہ باوجودیکہ مضامین طنزیہ ہیں اور ظرافت کے باب میں اضافہ کرتے ہیں۔ مگر افسوس ہے کہ ان میں جابجا مصدر کی علامتیں واضح نہیں کی گئی ہیں۔ صفت مشتبہ حالت میں ملتی ہے، کتاب میں صرف ایک بار ان کا استعمال ملتا ہے اس سے مراد غالباً کاتب ہو۔ جس کو شارحین نے کتابت کا غلط مطلب اخذ کر کے نہ جانے کیا قرار دے دیا ہو (ج ج ۱۱) صحت سے بعید ہے، یہ نسخہ بیسویں صدی سے متعلق ہے۔ (چ۔ رغ ۵/۳) جہاں تک میرا علم ہے یہ مضامین نصاب میں داخل کرنے کے لیے لکھے گئے ہیں۔ "ہنگامہ تحریر" نسخہ تبریزی مطبوعہ ان ظرحلبہ ششم ۱۱ حوالہ بلاسند کے ہے اس وجہ سے لئے مسترد سمجھا جائے۔ یہ مسئلہ مابہ النزاع ہے کیونکہ کسی مستند فرہنگ میں اس کا حوالہ نہیں ملتا۔ یہ جہلات کا ایک نادر مجموعہ ہے جو ۲۲ × ۱۲ فٹ کے ۲۶۲ رم صفحات پر مشتمل ہے۔ ۱۷ سطر فی صفحہ

اب بھی مل جاتے ہیں۔ مگر نایاب ہیں۔ اس سلسلہ میں ایک خط کا اقتباس قابل توجہ ہے۔
"میرا خط میرے نام" رسائل میں شائع کروانے کی غرض سے تحریر کیا گیا تھا۔ اب
تک کئی سال ناموں میں معمولی سی رد و بدل و ترمیم کے ساتھ شائع ہو چکا ہے۔ حافظے
کے لیے ملاحظہ ہو رسالہ "نرالی دنیا" "الٹی دنیا" "سیدھی دنیا" اور "جگمگی دنیا"
اس کے بعد چھپنے کی نوبت نہیں آئی۔ کیونکہ ہنگامہ ہو گیا تھا کہ میرے اعتراضات سنگین
اور صحیح ہیں۔ ملاحظہ ہو۔ گھریلو جھگڑے ص ۱۲۳۔ موٹر گائیڈ ص ۱۲۔ کرامات اُلٹی عرف لاجواب
یعنی ساجن موہنی ص ۲۲۔ اصولی بحث میں یہاں صرف چند اعتراضات پر اکتفا کروں گا
مثلاً کتاب کے صفحہ ۴۲ سطر ۳۱ میں "لا" کا غلط استعمال کیا گیا ہے جس کے لیے مصنف
کی تنبیہ ضروری ہے اور ہماری بحث سے خارج ہے، کیونکہ اس کو معاف کرنے
پر بھی اعتراض ہرگز رفع نہ ہوگا۔ پھر سند تو قطعی غلط ہے، حروف تہجی کی ترتیب سرے
سے غلط ہے۔ ابجد کے لحاظ سے کتاب کا پہلا لفظ الف سے شروع کرنے کے بجائے بے
سے شروع کیا گیا ہے۔ مصنف سخت تنقید کا مستحق ہے۔ ۹، ۸، ۷، ۶، ۵، ۴، ۳، ۲، ۱۔ اس
بات کو معترض الیہ کی جانب ہرگز نہ منسوب ہونا چاہیے۔ اس کے مایوس کن رویّہ سے
برانگیختہ ہو کر فحش و دشنام سے کام لینا یہ بھی ایک کام ہوگا۔ اس قسم کے کاموں کی سخت
ضرورت ہے۔ جن تحقیق کے شہ سواروں نے اس نسخے پر اب تک بھروسا کیا، ان کے ساتھ
تنبیہی کارروائی کا ہونا سخت ضروری ہے۔ الفاظ سے جابجا مترشح ہوتا ہے کہ بھو
کا ننا وار رکھا گیا ہے۔ الف ..... ب پ ت ٹ ث، ج چ ح خ، د ڈ ذ،
ر ڑ ز، س ش، ص ض، ط ظ، ع غ، ف، ق، ک، گ، ل، م، ن، و، ہ، لا، ھ
ی، ے، ص ۸، ص ۹، ص ۱۰، ص ۱۱، ص ۱۲۔ مثلاً ج کی جگہ ح کا استعمال کم از کم ۷ جگہ صریحاً

کیا گیا ہے جس کا نہ تو مزاح سے کوئی تعلق ہے اور نہ کاتب سے۔ یہ کھلا ہوا طنز ہے۔
رسالۂ حمزہ ص ۲۵، ص ۲۴، ص ۲۳، ص ۲۲ فتح میں، و، او، ر، ط، نیک النعمت، فی اتی تحت، الفحمہ
کا مصدر مضارعی سکوت کی حالت میں ملتا ہے۔ مزاح میں مرثیہ کی کیفیت کی ذمہ داری
اسی لاابالی پن پر ہے۔ ص ۲۵، ص ۲۵ لفظ کی تصغیر میں بامعنی لفظ کثیر الاستعمال محتاج ثبوت
و سند کے اعتبار سے خبط کرنے کے لائق ہیں۔ فقرات ترجا بجا نسخے میں ملتے ہیں جو قطعاً
نامعتبر ہیں۔ عبارت ذیل کے نکتے اس سلسلے میں حوالے کے بعد بھی فراموش نہیں کیے
جا سکتے، کیونکہ ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص
ہیں جس سے ثابت ہو جاتا ہے کہ اس نسخے کا تعلق بیسویں صدی سے ہرگز نہیں بلکہ اٹھارہویں
صدی سے ہے۔ اور مصنف مرد نہیں بلکہ کوئی خاتون ہیں جن کی اردو دانی میں بھی
شبہ ہے ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص ص

عروس ضمنیس بہ صفحۂ اول و صفحۂ ثانی میں جا بجا اشتباہ ہے۔ پھر یہ کہ کرہ ہمزہ بحذف
الف لغو اور سراسر مہمل ذا مستعمل، جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ خاتون جن کو ہم کبیدہ کے
نام سے فی الحال فرض کیے لیتے ہیں ان کے لیے "سہو طبعی بود" کہنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔
ص ۲، ص ۲۲، ص ۳۲، ص ۴۲، ص ۵۲، ص ۶۲، ص ۶۵، ص ۵۸، ص ۵۹، ص ۵۷، ص ۵۶، ص ۵۵، ص ۵۴، ص ۵۳، ص ۵۲

ص ۵۰ — — — — — — — — —

ان طنزیات میں "ش" کے ساتھ محترمہ "خ" بھی آئی ہیں اور "ب" کے ساتھ "پ" بھی۔
مگر افسوس کہ "ت" کے ساتھ "ٹ" نہیں ہے ورنہ ان طنزیات کی کچھ اور ہی شان پیدا ہو جاتی
ہائے ہوز کی سخت مٹی پلید کی گئی ہے۔ مصنف خود اس میں اپنے طنز کا نشانہ بن گیا ہے۔
ہائے خطی کی ٹھونسم ٹھانس سے طبیعت میں ایک قسم کا بھاری پن اور گراوٹ محسوس ہوتی

ہے۔ طنز سطحی ہو کر رہ جاتا ہے۔ وہ حبشی ہے اور حمزہ کے ساتھ ہے تو بھی کھٹکتی ہے ' واؤ ' کا کثرت استعمال کلاسی کی شان کے خلاف ہے۔ اس کو روایت سے بغاوت متصور کیا جائے گا۔

مخترعات مصنوعی جو منافقوں نے بعد میں بطور حاشیہ پیش کیے ہیں، جمع حاضر، واحد متکلم غائب کے صیغے میں چوتڑ کا استعمال نہایت بے باکی سے کیا گیا ہے مگر اس سے محرر کا احمق ہونا ثابت نہیں ہوتا۔ مگر یہ سند ہے کہ بیسویں صدی میں ' چوتڑ ' سنجیدہ مضمون میں بلا تکلف استعمال کیا جاتا تھا۔ یہ لفظ غریب نہیں تھا بلکہ سماج میں اس کی اہمیت تھی۔ مگر اس سے غلط فہمی پیدا ہو جانے کا خطرہ ہے۔ اس کے لیے کوئی مستند لطیفہ پیش کیا جانا چاہیے تھا، ضمائر میں مذکر و مؤنث کا التزام نہیں رکھا گیا ہے۔ اس میں مغرب کا اثر صاف جھلکتا ہے۔ ضمیر ر فاعل ر مکل ر صفت ر ر ر مصدر ر ر حرف ر مفعول ر ر ر ر اس کے بعد یہ بات پایۂ ثبوت کو پہونچ جاتی ہے کہ زیر نظر مخطوطے میں کیپوزنام کا فرد مرد نہیں بلکہ عورت تھی۔ اور طنز نگاری میں یدِ طولیٰ رکھتی تھی جس کی تاریخی اہمیت اپنی جگہ پر مسلّم ہے۔ اس پر مزید تحقیق کی گنجائش باقی رہ جاتی ہے کہ عورت تھی یا نہیں۔ واللہ اعلم بالصواب۔

(بہ طرز قاضی عبدالودود)

ٹائم ٹیبل

جب اسکول کھل گئے، پڑھائی شروع ہو گئی اور سبق یاد کرنے کا زمانہ آیا تو رفتہ رفتہ ہم نے بھی طے کیا کہ اب تھوڑا بہت پڑھنے لکھنے کا پروگرام بنا لیا جائے۔ پروگرام سے میرا مطلب ہر سال یہ ہوا کرتا ہے کہ ایک ایسا نظامِ حیات جو عملی جد و جہد کا ایک ایسا زندہ جاوید نمونہ ہو جس سے طالب علموں کی آنے والی نسلیں ابد الآباد تک فیض یاب ہوتی رہیں اور جس میں اگر مناسب حد تک تبدیلیاں گوارا کر لی جائیں تو وہ ہر قسم کے پیشہ ور اور پرائیوٹ حضرات و خواتین کے لیے قابلِ قبول ہو سکے جو عملی زندگی میں قدم قدم پر ٹھوکریں کھاتے رہنے کے باعث کچھ اس قسم کی کتابیں۔ "زندہ رہو اور زندہ رہنے دو"۔ "کامیابی آپ کے قدم چومنے کے لیے بے قرار ہے"۔ معرفت چنگا مل بکسیلرز اینڈ پبلشرز اینڈ پبلشرز۔ "مایوس ہونے کی ضرورت نہیں"۔ "رہنمائے روزگار با تصویر"۔ "مکمل مرغی خانہ"

"رضیہ کا شاہی دسترخوان" "کرامات اُگّھ حرف کالا جادو، یعنی ساجن موہنی" پڑھنے کے عادی سے ہو جاتے ہیں اور خالی وقت میں دریا میں چھلانگ لگانے اور خودکشی کرنے کے تازہ ترین طریقوں پر غور کرتے رہتے ہیں۔

اس پروگرام میں اتنی رعایت ضرور کی جاتی ہے کہ یہ پچھلے سال سے ذرا مختلف ہو ورنہ یہ بالکل اسکولی بن کر رہ نہ جائے۔ "اسکولی" سے میری مراد میرے اپنے اسکول سے ہے جہاں بیس سال سے وہی پرانا چپراسی گھنٹہ بجاتا ہے جس کی گھڑی کی سوئیاں نقلی ہیں اور وہ دن دہاڑے اونگھتا رہتا ہے، اسی سبب اکثر گھنٹہ بھی اونگھ جاتا ہے اور اس کے چونکنے پر کبھی گھنٹہ وقت سے پیشتر اور کبھی بعد میں بجتا ہے جس سے اسکول کا سارا نظام اوقات درہم برہم ہو جاتا ہے۔ اگر لڑکے یا اساتذہ کرام اونگھ جائیں تو کسی کا کچھ نہ جائے گا، مگر اس کے اونگھنے سے تو پورا اسکول اونگھ جاتا ہے۔ گھنٹہ تو اسکول کے سب سے ذمہ دار فرد کو بجانا چاہیے جو اسکول کے اعمال و افعال کا جوابدہ ہو، اور وہ فرد واحد سوائے ہیڈ ماسٹر کے اور کون ہو سکتا ہے۔ ثانوی اور اعلیٰ تعلیم کے مدارج پر یہ خوشگوار فرض پرنسپل صاحب، ہیڈ آف دی ڈپارٹمنٹ یا وائس چانسلر حضرات ہی بخوبی انجام دے سکتے ہیں۔ اس سے اور ہونے والے بے شمار فائدوں کے علاوہ ایک فائدہ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ ہم اس طرح ایک چپراسی کی تنخواہ بچا لیں گے جس کو آج کل فیشن کی اصطلاح میں "چھوٹی بچت" کے نام سے یاد کیا جا سکتا ہے۔ اور شہرت کا باعث ہو سکتا ہے۔ "اسکولی" میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں جن کا یادداشت سے براہ راست تعلق ہوا کرتا ہے۔ مثلاً جہاں تک ہم کو اور ہمارے دوستوں کو یاد پڑتا ہے ہمارے اسکول کے شمال میں جو ایک تنگ و تاریک کمرہ ہے جس کے

سامنے "ببا" لگا ہوا ہے اور انٹرول میں وہاں دو چار خوانچے والے بھی اپنا سودا فروخت کرنے کے شوق میں جمع ہو جاتے ہیں اور کثرت سے شور ہوتا ہے۔ اس شور کے سر پر وہ کمرہ ہے جسے عرف عام میں "اردو کلاس" کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ اس کی پہچان وہ واحد مولوی صاحب ہیں جو صبح سے آکر بیٹھ جانا۔ اونگھنا اور لڑکوں کو سزائیں دینا شروع کر دیتے ہیں۔ اسی گوشے پر ہماری یادداشت کی تہمت ہے کہ یہاں پر ہمارے بچپن سے اردو پڑھائی جا رہی ہے، مگر مسلسل دیکھنے کے باوجود بھی آج تک فیصلہ نہ کر سکے کہ کون پڑھا رہا ہے اور کون پڑھ رہا ہے۔ تقریباً اسی قسم کی مثالیں ہمیں دوسرے گوشوں سے دوسرے مضامین کے بارے میں آسانی سے مل جاتی ہیں، مگر اس پر کچھ کہہ اس وجہ سے نہیں سکتے کہ اسی اسکول نے بڑے بڑے نامور پیدا کیے اور پیدا کیے چلا جا رہا ہے۔

میرا یہ خود کاشتہ پروگرام ایک باضابطہ ٹائم ٹیبل کی صورت بھی اختیار کر سکتا ہے اور اس ٹائم ٹیبل سے مختلف ہو سکتا ہے جو عموماً اسکول والے زبردستی طلبا کے اوپر لاد دیا کرتے ہیں۔ اسکول والوں کی عادت ہوتی ہے کہ وہ نہایت "انسانِ کامل" قسم کا ٹائم ٹیبل پیش کر کے کچھ فاصلے سے مزہ لیتے ہیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جو وقت مقرر کر دیا گیا ہو اس کے آس پاس گھنٹہ ضرور بجے گا، اندازے سے تھوڑی دیر سویر میں لڑکے ضرور آئیں گے۔ اگر ماسٹر صاحبان غیر ارادی طور پر آگئے ہیں تو وقت گزاری کے طور پر ادھر ادھر کے بے ربط سوالات، سیاسیات حاضرہ پر تبصرے موسم پر رننگ کمنٹری، ہیڈ ماسٹر صاحب وغیرہ کے اعمال و افعال پر بہت سخت نکتہ چینی کے ساتھ ساتھ (وجہ اگر ہم لوگ کریں تو ضرور حرام خور کہلائیں)، بار بار بے اختیار اپنے معصوم ہونے کا یقین دلانے کی ناکام کوشش کریں گے۔ ایسے موقعوں پر تجربہ ہے کہ اگر تھوڑا بہت شور ہو جائے تو چند اں

مضائقہ نہیں ۔ اس قسم کی "لٹریچر" کارروائیوں میں اگر تھوڑی سی تبدیلی محسوس بھی ہوتی ہو
تو وہ فن کے اعتبار سے ورنہ تکنیک تو بالکل وہی رہتی ہے ، مثلاً بڑی جماعتوں میں
غیبت کرنے والے کے منھ سے جماعت کے اندر خاص طور پر اور جماعت کے باہر عام
طور پر منطق ، استدلال ، ہیئت ، نقد ، شعور ، لاشعور اور بے شعور وغیرہ بہم اصطلاحیں
سنائی دیتی ہیں ۔ اور عام طور سے اس کا اثر آنے والے امتحانوں پر بہ حیثیت مجموعی
بہت برا پڑتا ہے ۔

یہ تو عمل ہوا اور اس کا ردعمل یہ ہوتا ہے کہ اگر ہم اس پر عمل بھی کرنا چاہیں تو کبھی
لڑکے غائب اور کبھی استاد ، اجتماع ضدین کے اس عمل میں سارا سال گزر جاتا ہے ۔
یہاں تک کہ دوبارہ اسی ٹائم ٹیبل کو نئے کاغذ پر ٹائپ کر کے نوٹس بورڈ پر آویزاں کر دیا
جاتا ہے تاکہ تازہ واردانِ بساط بھی پچھلی بہاروں سے مفت فیض یاب ہو سکیں ۔

اس قسم کے ٹائم ٹیبل سے ہم کیوں علاقہ رکھیں جس میں صبح سے شام تک ایک ہی استاد ،
ایک ہی لڑکے اور ایک ہی قسم کے کمرے ہونے کے سبب ہم فلم کی اصطلاح میں نئے چہروں کو
بالکل ترس جاتے ہیں ۔ استاد لڑکوں کی نقل و حرکت سے نالاں ، لڑکے استاد کی صورت
سے بیزار ، مگر دونوں ایک دوسرے سے رحم کے طالب ، ایک دوسرے کے فعل پر رحم آ رہا
ہو مگر فعل جاری ہے ۔ کیونکہ ٹائم ٹیبل بتاتا ہے کہ اگر سورج نکلنے سے پہلے بھیج دیئے گئے
ہو تو اب کم سے کم چراغ جلے تو گھر لوٹو ۔ یہ ٹائم ٹیبل کچھ اس قسم کا ہوتا ہے جیسے کہ عام طور
پر ٹائم ٹیبل ہوا کرتے ہیں ۔ مثلاً ریلوے کا ٹائم ٹیبل جسے خریدنے کے بعد آج تک سمجھ میں نہ
آیا کہ اس کا مصرف کیا ہو ۔ جس کی وجہ سے ہم نے ان لوگوں کو اکثر رشک و حسد کی نگاہ
سے بھی دیکھا جو اس کو سونگھ کر سارے دن کی آنے اور جانے والی تمام گاڑیوں کا نقشہ

زبانی کھینچ دیتے ہیں۔ اس قسم کے ٹائم ٹیبل پر ہوئے عمل کے سب کچھ ہو سکتا ہے۔ اور عمل اس وجہ سے نہیں کہ یہ عمل سفلی کے مترادف سمجھا گیا ہے جس میں ناکامی کی صورت میں عامل خود اس کا شکار ہو جاتا ہے اس لیے نقل سے عمل کی نوبت آنے ہی نہیں پاتی۔

ہاں تو ایک تو جو ایہ ٹائم ٹیبل جس کو ہم زیادہ سے زیادہ دیکھتے دیکھتے کسی نہ کسی دن پنسل سے نوٹ کر لیتے ہیں یا پھر کسی لڑکے سے نقل مل جاتی ہے۔ مگر اس نقل سے عمل کا کچھ کردار نہیں ابھر پایا۔ یعنی اس کے بعد بھی جس دن جماعت میں سب کے سامنے ڈانٹ پڑنے سے ہم کو اپنی بے قاعدگی کا احساس ہو جائے کہ ہم غلطی سے حساب کے بجائے جغرافیہ کے کلاس میں اپنے کو پا رہے ہیں یا ہیں سکنڈ ایر میں اور اٹھائے فرسٹ ایر سے جا رہے ہیں یا خالی گھنٹے میں تواریخ کے کلاس لگنے کا شدت سے انتظار کر رہے ہیں۔ اور تواریخ کے گھنٹہ کو خالی سمجھ کر گھر کھانا کھانے چلے جا رہے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر ہنسی اڑ جائے سب کو ہنستا دیکھ کر ہم بھی ہنس دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ آج پھر گھر جا کر ہم کو ٹائم ٹیبل کی اصلاح کرنا ہے تاکہ اپنے ایک ذاتی اور کامیاب قسم کے پروگرام بنانے میں حتی الامکان مدد مل سکے۔ ایسے آزمائشی دور میں جبکہ ارادہ پکا، نیت صاف، دل حرکت و عمل پر آمادہ ہو، ترقی کرنے کی خواہش پیدا ہو کر انگڑائیاں لیتی ہو اور اپنے ساتھیوں سے آگے بڑھ جانے کا حوصلہ مچلا نہ بیٹھنے دیتا ہو تو پھر یہ سارا وقت اس ٹائم ٹیبل کی تلاش میں صرف ہو جاتا ہے جس کو ہم نے کبھی اسکول میں نقل کیا تھا اور جس کی ضد میں اب ہم ایک کامیاب ٹائم ٹیبل بنا کر اس پر عمل کرنے کے لیے بے چین نظر آ رہے ہیں۔ کسی نے سچ کہا ہے کہ مصیبت کے دن سدا نہیں رہتے اور کسی کی محنت اکارت نہیں جاتی اور آخر کار ہماری یہ سپاہیانہ جدوجہد رنگ لاتی ہے وہ ٹائم ٹیبل کسی میز، الماری یا کرسی کے نیچے کسی

پرچے، کتاب کے ٹائیٹل پیج، سینما کے اشتہار، یا اقتصادیات کی کاپی کے اس مقام پر بالکل بیچ بیچ حالت میں جہاں پر ہم نے حساب کے گھنٹے میں کانٹا گولا کھیلا تھا، اور پچھلی اتوار کو اسی صفحہ کے بائیں طرف دھوبن کے کپڑے لکھے تھے۔ ہم کو ہمارا گم شدہ ٹائم ٹیبل مل جاتا ہے جب پر مسلسل غور و فکر کے بعد اکثر کچھ کچھ سمجھ میں آنے لگتا ہے کہ آخر یہ کہا کیا گیا ہے۔ خود اپنی عبارت ایک مصیبت بن جاتی ہے، لکھا کچھ ہوتا ہے اور پڑھنے میں کچھ آتا ہے۔ اس قسم کی مبہم عبارتوں کا پڑھنے لکھنے پر بھی برا اثر پڑ سکتا ہے ایسے ناشدنی موقعوں پر وہی حصہ سب سے بہتر رہتا ہے جو جلدی میں لکھنا بھول گئے تھے۔ مثلاً ایک موٹی سی بات ہے کہ اب رہ رہ کر یاد کیا جا رہا ہے کہ انٹرول کہاں ہے؟ باوجود اس کے کھو جانے کے ہم کو اچھی طرح یاد ہے کہ کہیں نہ کہیں پر انٹرول بھی ضرور تھا۔ مگر جو شخص دن میں تین چار بار انٹرول منائے اس کے لیے یوں بھی اصلی انٹرول کا پتہ لگانا مشکل ہو جاتا ہے۔ اصلی انٹرول اسے کہتے ہیں جس کا وقفہ مختصر اور بھیڑ بھاڑ زیادہ ہوتی ہے، مگر اس کی اہمیت اس وجہ سے زیادہ ہوتی ہے کہ اس موقع پر کوئی روک تھام نہیں ہوتی۔ مگر اس وقت تو انٹرول کی تلاش خود ایک انٹرول ہے۔

غرض ایک تفصیلی چھان بین، تنقید و تحقیق، غور و فکر کے بعد ہمارے ذہن میں عین ہمارے تصورات کے مطابق ایک نہایت واضح نقشہ اس پروگرام کا بن گیا جس کے نہ ہونے سے ہم کو اپنی زندگی نہایت فضول معلوم ہونے لگی تھی، اور اکثر اس کے مصرف پر ہم اپنے دل میں غور کرتے اور دماغ سے سوالات کرتے اور جواب نفی میں آتا، تن بدن میں مایوسی کی ایک لہر کو دوڑنا پڑتا۔ بے اختیار اپنی بے بسی کا خیال آ دھمکتا۔

اس پروگرام نے ہمارے خون کی روانی میں ایک تیزی پیدا کر دی، ایسی تیزی جس نے نوجوانوں کو کبھی نچلا نہیں بیٹھنے دیا، لہٰذا بے اختیار اکڑ کر بیٹھ گئے۔ دو چار بار بے اختیار

پیلو بولے، عجیب عجیب مُنہ بنائے۔ لیکن اگر کوئی ہم کو اس وقت دیکھتا تو قطعی یہ اندازہ لگا لیتا کہ اس وقت ہم بے حد خوش و خرم ہیں۔ ایسی فطری خوشی جو طبیعتوں کو موسیقی کی جانب مائل کر دیتی ہے۔ چنانچہ شگون کے طور پر ایک آدھ سیٹی بھی بجا ڈالی اور اس کی دُھن پر ایک فلمی راگ بھی چھیڑ دیا۔ کیونکہ سر کے اوپر سے ایک بڑا بوجھ اُتر چکا تھا، اور اب جو کچھ رہ گیا تھا اس کی حیثیت دفتری خانہ پُری سے ہرگز زیادہ نہ تھی۔ اس وجہ سے اس کے انجام دینے میں ہم اب قطعی جلدبازی سے کام لینا نہ چاہتے تھے۔ اس لیے ہم نے طبیعت کو لطیف بنانے کے لیے نہانے ہی میں اپنی بہتری سمجھی۔ نہانے کے بعد بہترین کپڑے پہنے، اخبار دیکھا، کون فلم کہاں لگا ہے۔ ایک دیکھا ہوا فلم دیکھنے کی خواہش دوبارہ پیدا ہوئی، سائیکل اٹھائی، سنیما کا رُخ کیا، موڈ اچھا اور طبیعت آمد پر تھی اس لیے اکثر راستے میں سائیکل کا ہینڈل چھوڑ دیتے، اور سائیکل بالکل ایسی چلنے لگتی جیسے "پاکستانی سیاست"، پھر جلد ہی اس کی باگ قابو میں لانے کے لیے ہینڈل کو دوبارہ اپنی کمان میں لے لیا۔ راہ گیر بھی مطمئن ہو گئے اور تماشائی بھی منتشر۔

فلم دیکھ کر لوٹے تو ایک قسم کی تکان محسوس ہوئی اس لیے پروگرام اونگھتے میں تیار کرنے کے ارادے سے سو گئے، شب و روز اسی طرح گزرتے رہے۔ ایک ماہ کی مسلسل محنت، لگاتار غور و فکر کے بعد ہم نے ایک پروگرام تیار کر لیا، اتنا مکمل "ٹائم ٹیبل" تو ہم پچھلی بار بھی نہ تیار کر سکے تھے۔ اس میں اول تو ہم نے یہ خیال رکھا کہ پچھلے سال جو غلطیاں امتحان پاس کرنے کے سلسلے میں ہم سے سرزد ہو گئی تھیں ان کے دوبارہ ہونے کا احتمال نہ رہے۔ غلطیاں ہونا بُرا نہیں، لیکن اگر غلطی نئی ہو تو کیا مضائقہ ہے۔ اس میں شرمندگی کا موقع ذرا کم رہتا ہے۔ ورنہ کچھ مناسب نہیں رہتا۔

ہمارا یہ ٹائم ٹیبل جنگی پیمانے پر تیار کیا گیا تھا۔ اس میں ہماری روزمرہ کی زندگی کے بارے میں ہنگامی حالات کا اعلان کر دیا گیا تھا۔ پروگرام کیا اچھا خاصا کرفیو آرڈر تھا جس کا نفاذ مثل مارشل لا کیا گیا تھا۔ اس ٹائم ٹیبل میں جس قدر بھی مفید مشورے ممکن ہو سکتے تھے ہم نے اپنے آپ کو ٹھونس ڈالے تھے، اپنی صحت اور اصلاح کا کوئی بھی پہلو نہیں چھوڑا تھا۔ بعض اوقات تو شبہ ہوتا تھا کہ یہ ٹائم ٹیبل ہے یا کسی لیڈر کے الیکشن سے قبل ہونے والی تقریر۔ یہ دراصل کچھ حسب ذیل سا تھا۔ مثلاً روزانہ :-

۴ بجے۔ (صبح کاذب) : زن سے اٹھ بیٹھنا (اگر ممکن ہو تو ½ ۳ ہی بجے سے) اگر بیدار ہونے کے روزمرہ میں کچھ پیچیدگیاں پیدا ہونے کا خطرہ ہو تو بیداری کے لیے گھڑی کا الارم لگا دیا جائے یا غسل خانے کا پائپ کھلا چھوڑ دیا جائے (ہر طرح ناکامی کی صورت میں) چوکیدار کو آواز لگانے کی ہدایت کر دی جائے)

۰۔۴ تا ۵۔۴ : حوائج ضروریہ سے فراغت حاصل کرتے ہی غسل کرنا، عبادت کرنا۔

۵۔۴ تا ۱۵۔۴ : میل بھر کی دوڑ اور صبح کی سیر، (واپسی پر چنے کا پانی پی کر پڑھنے بیٹھ جانا)

۱۵۔۴ تا ۱۵۔۷ : دل لگا کر پڑھنا۔

۱۵۔۷ تا ۲۵۔۷ : ناشتہ کرنا۔

۲۵۔۷ تا ۲۵۔۹ : وہ تمام مضامین پڑھ ڈالنا جو آج اسکول میں پڑھائے

جائیں گے اور اسکول کا کام کرنا۔

۹-۲۵ تا ۹-۴۵ : کھانا کھا کر کپڑے تبدیل کر کے کتابیں کا بیان درست کر کے اسکول روانہ ہو جانا کہ ٹھیک ۱۰ بجے اسکول پہونچ جائیں۔

۱۰-۰ تا ۴-۰ : اسکول میں، جس میں انٹرول میں کھیل اور خالی وقت میں مطالعہ فطرت میں دلچسپی لینا، اخبار پڑھنا، جن استادوں کے پاس امتحان کی کاپیاں جانے کا احتمال ہو ان سے تعلقات استوار کرنا۔ ان کے آپس کے جھگڑوں سے فائدہ اٹھانا وغیرہ۔ (مگر ایک مناسب حد تک)

۴-۰ تا ۴-۱۵ : اسکول سے گھر واپس آنا، کپڑے تبدیل کر کے ناشتہ کرنا۔

۴-۱۵ تا ۴-۲۵ : سیر و تفریح۔

۴-۲۵ تا ۸ بجے شب : وہ سب پڑھ ڈالنا جو آج پڑھایا گیا تھا۔

۸-۰ تا ۸-۵ ؍؍ : رات کا کھانا کھا کر قیلولہ کرنا۔

۸-۵ تا ۱۲-۱۵ ؍؍ : مسلسل سبق یاد کرنا۔

۱۲-۱۵ تا ۴-۰ صبح : سونا۔

ہفتہ کے دن اسکول سے واپسی پر اگر سنیما یا میچ دیکھنے چلے جائیں، یا دوستوں کے ساتھ گپ شپ کے لیے کافی ہاؤس وغیرہ کا ایک آدھ چکر لگا لیا جائے، تو نامناسب نہ ہوگا۔ لیکن مناسب ہوگا کہ حتی الامکان

پرہیز کیا جائے۔ اتوار اور چھٹیوں میں درمیانی وقفہ (۱۰ تا ۱۴) میں
امتحان کے پرچے تیار کرنا، گھڑی سامنے رکھ کر ان کی مشق کرنا۔
حل شدہ پرچے پڑھنا، گیس ورک تیار کرنا، ماسٹر صاحب سے
امپارٹنٹ پوچھنے جانا وغیرہ۔

اطلاعاً عرض ہے کہ یہ ایک ایسا جامع پروگرام تھا کہ اس کو محض دیکھ کر بڑی مسرت
ہوتی تھی۔ اکثر و بیشتر اس ٹائم ٹیبل کے کچھ حصوں پر عمل کرنے کی بھی کوشش کی گئی۔ نہ جانے
کیسے کیا ہوا کچھ کہا نہیں جا سکتا مگر اتنا ضرور علم ہے کہ اسی غور و فکر میں رفتہ رفتہ سال
تمام ہوا اور جو کچھ نتیجہ برآمد ہوا اس نے دوبارہ سوچنے پر مجبور کر دیا کہ اس ٹائم ٹیبل میں کیا
ایسی چیزیں پھر بھی رہ گئی تھیں جن کو اگر شامل کر دیا جائے تو ایک کامیاب "ٹائم ٹیبل"
تیار ہو جائے جس پر عمل کر کے میرا "پہلا ون ایر پلان" کامیابی کا منہ دیکھ سکے۔

آموختہ خوانی میری

(اردو کے ممتاز خود نوشت سوانح نگاروں سے معذرت کے ساتھ)

باتیں بنانا آسان ہوتی ہیں، بات میں بات پیدا کرنا اس سے بھی آسان، مگر باتوں باتوں میں اپنی تعریف کرنا مشکل ہوتی ہے، اور اپنے مطلب کی بات کہنا اس سے بھی زیادہ دشوار۔ میرا حال اس داستان طراز کا ہے جسے یاد نہیں کہ اس نے بات کہاں سے شروع کی تھی اور کہاں پر ختم کرنا ہے۔ گویا آج آپ کا سابقہ اس اناڑی لطیفہ گو سے پڑا ہے جو لطیفہ سنائے بغیر رہ بھی نہیں سکتا اور پورا لطیفہ سنا بھی نہیں سکتا۔ لہذا ہنسنا ہنسانا آپ کے ذمہ اور بھول چوک میرے۔

فرض کر لیجئے کہ میں ہندوستان کے ایک بہت ہی اعلیٰ خاندان میں پیدا ہوا۔ بالفرضِ محال آپ "اعلیٰ ترین" نہ بھی تسلیم کریں تو لفظ "اعلیٰ" پر میں آخر دم تک اصرار کروں گا۔ یعنی یہ وہ افضل ترین ایشیائی خاندان ہے جس کا سلسلۂ نسب باپ کی طرف

حضرت آدم اور ماں کی جانب اماں حوا سے چل کر اُمت ابراہیمی پر ختم ہوتا ہے اور برادران
یوسف کا یہ زلیخائی کارواں اگر ایک طرف اپنا سرا امام حسین سے ملاتا ہے تو دوسری
جانب جناب سیدہ سے اور ان خالص خوشبودار سیدوں کا خون ہندوستان آتے
آتے سیاہ ہوجاتا ہے۔ لہٰذا یہ کالے سید جو حسب معمول سلاطین دہلی کی متواتر دعوتوں
پر مملکت ہندوستان میں ظہور پذیر ہوئے تھے اور آتے ہی بڑے بڑے عہدوں
پر فائز ہوئے، خلعت اعزاز و جاگیر سے نوازے گئے۔ سلطنتوں کے عروج و
زوال میں ہمیشہ ان کا بڑا دخل رہا۔ سلطنتِ مغلیہ کے زوال کے ساتھ ساتھ ان کا بھی
زوال ہوا۔ کچھ پرانی حکومت کے وفادار ہونے کی وجہ سے جاگیروں کے ساتھ
جان سے بھی گئے اور کچھ نئے حکمرانوں کے وفادار ہوجانے کی وجہ سے امپیریل کاؤنسل
اور برٹش پارلیمنٹ کے ممبر ہوئے، مقابلے کے امتحانوں میں کامیاب ہوکر اعلیٰ عہدوں پر
فائز ہوئے۔ پہلے والے وطن کی راہ میں شہید ہوئے اور بعد والے وقت کے ساتھ آگے
بڑھے، آزادی کے بعد کچھ نے جاکر پڑوس کی باگ ڈور سنبھالی اور کچھ نے یہاں کی حکومت
پر اکتفا کیا۔ ان میں سے بیشتر ہنرمند وزیر باتدبیر بنے اور محبِ الوطنی میں اپنا نام کر گئے۔
یہ سب میں نے اس وجہ سے بیان کیا ہے کہ اس سے ہمارے خاندان کے سیاسی و سماجی
حالات و تاریخی پس منظر سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

اس عظیم الشان خاندان میں ہمارا گھرانا بھی شامل ہے۔ جس میں بیٹھے بیٹھے
کھلانے اور "پدرم سلطان" کا رواج ہے۔ بقول والد مرحوم "تاریخ میں اگر کوئی قابلِ ذکر
ہستی گزری ہے تو وہ کسی نہ کسی حیثیت یا تعلق سے ہم سے یا ہمارے خاندان والوں سے
ضرور متعلق رہی ہے۔

ہمارے گھرانے میں ہمیشہ سے مشاعرے، مناظرے، نوٹنکی اور بیت بازی وغیرہ کا رواج عام ہوتا جس میں بزرگوں سے لے کر دودھ پیتے بچے تک حصہ لیتے تھے۔

میں نے شیر خواری کے عالم سے وعظ کی محفلوں میں جانا اور سنیما کے بہانے ان نشستوں میں شرکت کرنا شروع کر دی تھی، جہاں فلسفہ، حکمت، نجوم ہیئت، رمل اور دوسرے علوم معقول و منقول پر بحثیں چھڑی رہتی تھیں، اس زمانے میں میں شیشی کا دودھ پیتا اور علمائے کرام، اہلِ کمال و بڑے بوڑھوں کی صحبتوں سے لطف اندوز ہوتا تھا۔ دنیا کے دوسرے بڑے لوگوں کی طرح میں بھی چھپ چھپ کر فلسفیانہ رسائل پڑھا کرتا۔

اس زمانے میں مجھے کروڑوں کی تعداد میں اشعار زبانی یاد ہو چکے تھے، بات بات پر شعر حرحن کرنے لگا تھا۔ بلکہ اکثر آل انڈیا شاعروں سے گفتگو شعر و شاعری پر رہتی۔ اس زمانے کا آل انڈیا آج کل کے انڈیا سے بڑا اور بھاری بھرکم ہوا کرتا تھا۔ کیونکہ اس میں موجودہ پاکستان کے علاوہ برما اور سیلون بھی ہوا کرتے تھے، بعد میں لے دے کے سیلون رہ گیا اور وہ بھی بال و کسر کی حد تک۔ اگر اساتذہ میں سے کسی پر سرقہ یا توارد کا الزام عائد ہوتا تو وہ مجھ سے استفادہ کرنے کے لیے حاضری دیتے اور بامراد واپس ہوتا۔

پانچ سال کی عمر میں جبکہ ہمارے گھروں کے بچے کھلونوں اور غباروں کے لیے ضد کرتے ہیں۔ میں میونسپل پارک میں پتنگیں لوٹنے اور گلی ڈنڈا کھیلنے کے بجائے سیاسی جلسوں اور ادبی مباحثوں میں شرکت کرتا۔ تیسری جماعت میں جہاں درجہ کی پڑھائی اور رنگ ریڈر کی رٹائی میرے منہ کا ذائقہ خراب کر دیتی وہاں میں

گلستاں، بوستاں و اخلاق ناصری سے لے کر اخلاق جلالی تک گھول کر پی چکا تھا، مگر ان کے اظہار کا موقع نہ پاکر بڑی گھٹن محسوس کرتا۔ عام طور پر میں بلا سبق پڑھے جماعت میں چلا جاتا اور اپنی باری پر، پوری پوری کتاب مع صفحہ و سطر کے حوالے دے کر سنا دیتا اکثر یہ بھی بتا دیتا کہ اس سبق میں بنیادی طور پر کیا خامی ہے اور اس کی کہاں تک ذمہ داری موجودہ طریقۂ تعلیم و نصاب کے ناقص ہونے پر ہے۔

چوتھی جماعت میں دوسرے مضامین کے ساتھ ساتھ صاحب دیوان شاعر بھی ہو چکا تھا اور ساتھ ہی ساتھ تمام اساتذہ کے دیوان کا حافظ بھی۔

بہ حیثیت طالب علم کے اسکول میں میرا کوئی ثانی نہ تھا۔ ہمیشہ اول پاس ہوتا۔ اسی زمانے میں میں نے آفاقی ادب کے تمام قابل ذکر ناول اور فلسفے کی بیشتر اہم کتابیں چاٹ ڈالی تھیں۔ نتیجہ کے طور پر میری وسعت مطالعہ پھیل کر خود میرے لیے پیچیدگیاں پیدا کرنے لگی تھی۔ میری مثال اس پھل کی سی تھی جو اپنے وقت سے پہلے پک گیا ہو۔ یعنی بادی النظر میں ڈال سے زیادہ پال کا معلوم ہوتا تھا۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ مجھے دوسروں کو مرعوب کرنے میں لطف آنے لگا۔ لہذا جو رعب کھا جاتا وہی میرا ہم نوا درپا ہو جاتا، یہ سلسلہ اب بھی جاری ہے اسی وجہ سے اپنے زمانے کے اہم ترین لوگ میرے مداح ہیں۔ اور جن سے میں خود نہ مل سکا وہ خود کسی نہ کسی بہانے آکر مجھ سے مل لیے۔ یہ لکھتے وقت مجھے بُری طرح وہ تمام بڑے لوگ بے اختیار یاد آ رہے ہیں جو میرے گرویدہ ہیں۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں کہ ابھی میری مسیں بھی نہ بھیگی تھیں، مونچھوں کے کونڈے تک نہ ہوئے تھے کہ آفاقی ادب، ادیبوں و تحریکوں سے متاثر ہو چکا تھا۔

چھوٹا موٹا ادیب تو میں شروع ہی سے خاطر میں نہ لاتا تھا، خصوصاً وہ لوگ جو نہ کسی اعلیٰ عہدے پر تھے نہ بہت اچھے خاندان سے تعلق رکھتے تھے نہ بہت زیادہ خوش پوشاک بانکے طرح دار شخصیت وحیثیت کے مالک تھے۔ وہ جب اپنے آپ کو فن کار بتاتے تو میں سانس کھینچ لیتا، گم سم ہو جاتا، اپنے آپ کو قابو میں رکھنے کے لیے اور ان کو نظرانداز کرنے کی بڑی ہی کامیاب کوشش کرتا۔

اشراف کے سلسلے میں جہاں تک میرا حافظہ کام کرتا ہے میں نے ہمیشہ ان سے سیڑھیوں کا کام لیا۔ مثلاً جب مجھے صوبے کے وزیر اعظم سے ملایا گیا تو بہت سے ماہرین کو بھول گیا۔ مگر کچھ دن بعد پھر نائب ہوا اور گورنر صاحب کا کلمہ پڑھنے لگا جو ہمارے چانسلر بھی تھے لیکن بعد وائس چانسلر صاحب کو بھلا دینا قطعی فطری عمل تھا مگر وائس چانسلر صاحب مجھے نہ بھلا سکے اور ابتدا میں انھیں بھی رام رکھا، کچھ دن بعد وہ ریٹائر ہو گئے اور ہر فانی چیز کی طرح انھیں بھی بھلا بیٹھا۔ ان کی خدمت میں میں نے جتنے سپاس نامے و تقریریں لکھی تھیں وہ سب مجھے اب تک حفظ ہیں۔ اس سلسلے میں وہ میرے بہت مداح و معترف تھے۔ اور ان کی وہ تعریفیں اس زمانے میں میرے بہت کام آتی تھیں۔

شاید ہی علم کا کوئی ایسا شعبہ اور فن کا ایسا خانہ ہو جس میں مجھے کمال کی حد تک عبور حاصل نہ ہو۔ اس کے باوجود میں فطرت کی طرف سے بڑی پُرسوز شخصیت لے کر آیا ہوں، میں ہر اس واقعے سے انتہائی آبدیدہ ہو جاتا ہوں جس پر پبلک میں میری شنوائی کچھ اور زیادہ ہو جائے، خصوصاً بڑے آدمیوں کی موت، میرا عہد بڑے آدمیوں اور بڑائی سے رخصتی کا عہد ہے۔ میرے کتنے مداح، عزیز، احباب، حاکم، یہ سب بڑے لوگ ایک ایک کر کے اس گنگا جمنی تہذیب کی بساط سے اٹھتے جا رہے ہیں، اور

تعزیہ داری کے لیے اپنی خلوت گاہ میں میری وہی حیثیت رہ گئی جو شام غریباں میں ماتمی شمع کی۔

ایک بہت بڑے مفکر کا قول ہے کہ "اپنے موقع پر سچ بولنا ممکن ہے۔" میں کوئی میجک پروفیسر نہیں جو پبلک کو خوش کرنے کے لیے اور ناممکن کو ممکن بنانے کے لیے شعبدہ بازی پر اتر آؤں۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ اسی لیے میں ایک برے سے جھوٹ بولتا چلا آرہا ہوں۔ مجھ میں اتنی ہمت کہاں کہ میں سچ بول کر اپنے پول کھول دوں۔ یہ تو وہ زمانہ ہے جبکہ لوگ نجی خطوط بھی تھوڑی سی شہرت پا جانے کے بعد بہت سجا بنا کر لکھنے لگتے ہیں تاکہ مرحوم ہو جانے کے بعد ان خطوط کے شائع کرنے میں دقت کم اور شہرت زیادہ ہو، یہ ٹھہری میری اپنی خود نوشت سوانح جو چھاپے جانے کے لیے لکھی جا رہی ہے۔ یہ میں اس لیے بتا رہا ہوں کہ آپ کو میری خود نمائی کی عادت کو سمجھنے اور اس کا نفسیاتی تجزیہ کرنے کا موقع مل سکے کیونکہ یہی وہ حرکتیں ہیں جنھیں ہم مسلسل شعوری طور پر غیر شعوری بتا کر کرتے رہتے ہیں اور آخر میں سچ کی ابدی تاریخ میں اپنے لیے جگہ بنا لیتے ہیں۔

دوران تعلیم ایک دفعہ فرقہ وارانہ فساد ہو گیا۔ آپس کے تعلقات خاصے کشیدہ ہو چکے تھے اس بات کا میں نے اتنا اثر لیا کہ بیمار پڑ گیا، اور عرصہ تک بسم اللہ کے گنبد میں جاولوں پر قل ہو اللہ پڑھ پڑھ کر دم کرتا رہا۔ یہاں تک کہ دلوں کے بخار میری وجہ سے بڑی حد تک نکل گئے۔ البتہ میرے خاندان کے متعدد صلح پسند حضرات و خواتین اس صدمہ کی تاب نہ لا سکے اور اللہ کو پیارے ہوئے۔ مگر میں سخت جان تھا اس لیے بچ نکلا۔

کالج پہونچ کر آخر دم تک فیصلہ نہ کر سکا کہ میرے استاد اچھے نہ تھے یا میں خراب طالب علم تھا۔ ہر سال فیل ہو جانے کے باوجود دنیا کا تمام عظیم ادب گھول کر پی چکا تھا۔ کوئی شوق ایسا نہ تھا جو پروان ہو چکا ہو، کوئی حسرت ایسی نہ تھی جو نکل نہ چکی ہو۔ سارے "ازم" میرے ناخنوں میں تھے، مگر گومتی پار کرنا میرے لیے معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ اس کے باوجود میرا یہ عقیدہ راسخ ہو چکا تھا کہ جن استادوں سے میرا سابقہ پڑا اُن سے پڑھ کر میرا علم گھٹ گیا جس کی وجہ سے بات کم کرنے لگا اور شاعری زیادہ۔

ایک ایسے گھرانے سے تعلق رکھنے کی وجہ سے جس کو ورثہ میں عظیم روایات ملی تھیں میں لکیر کا فقیر ہو گیا اور زندگی بھر ناک کی سیدھ پر چلنے کا عادی رہا۔ اس کا کچھ سبب تو یہ ہے کہ نہ تو اپنی زندگی کی وسیع شاہراہ پر گامزن رہنے کے لیے مجھے کسی پگڈنڈی سے گزرنا پڑا اور نہ کبھی اس گرینڈ ٹرنک روڈ پر کوئی کھانچا یا کھائی ملی۔

اب مجھے ان حقائق کی جانب آپ کو پھر متوجہ کر لینا چاہیے جن سے میری عظمت کے نقش آپ کے ذہن میں زیادہ واضح طریقہ پر اُبھر سکیں۔ مثال کے طور پر بچپن میں یا تو سر سید احمد خاں کے ملازم کو جواب دینے پر گھر سے نکال دیا گیا تھا یا مجھے اس واقعے کی مماثلت کے بعد میں اور سر سید برابر ہو جاتے ہیں، مگر کچھ خوبیاں مجھ میں ایسی ہیں جن سے مرحوم محروم تھے۔ یہاں میں ان سے افضل و بہتر ہو جاتا ہوں، اگر اسی طرح آپ میرا موازنہ سر سید سے لے کر جدید ترین دور تک کی تمام اہم شخصیات و واقعات سے کریں تو بار بار آپ پر یہ حقیقت واضح ہوتی چلی جائے گی کہ اس برصغیر نے مجھ جیسا افضل و اشرف نہ مجھ سے کئی صدی قبل پیدا کیا اور نہ مجھ سے سیکڑوں برس بعد تک اس کی امید پائی جاتی ہے۔ حقائق آپ کے سامنے ہیں سب پردے اٹھانے کی دیر ہے۔

اور یہ ادیہ میری بڑائی کی دلیل ہے۔!

جیسا کہ بارہا عرض کر چکا ہوں قدرت نے شروع ہی سے جس فیاضی کے ساتھ میرے لیے مواقع فراہم کیے وہ لطف بیان سے خالی نہیں، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاید ہی کوئی کام یا ادارہ ایسا ثابت ہو سکا ہو جو بغیر میرے کنٹرول کے اپنے ہنر دکھا سکا ہو۔ اور حاکم و حکومت جو خود سب سے بڑا ادارہ ہیں ان کی بجا و بے جا سرپرستی کی وجہ سے میں شاید شمار کر کے نہ بتا سکوں کہ کتنے اداروں کی کارکردگی، دیکھ بھال، ترویج و اشاعت میرے ذمے آ گئی، جس سے گریز میرے لیے ممکن نہ رہا۔ ہر چند کہ میں ذمے داریوں کی کسوٹی پر شروع سے پورا نہ اتر سکا۔ اس کے باوجود میری ذمہ داریوں کا حلقہ وسیع ہوتا گیا اور کامیابی دن دونی رات چوگنی میرے قدم چومتی گئی۔

میرے بچپن میں نوجوان اساتذہ کی خدمت میں حاضر رہتے تھے اور علم مجلس سے اپنا دماغ روشن کرتے تھے، میری نوجوانی میں اس بدعت کا چلن بگڑا اور پہلے تو اساتذہ مختلف سرکاروں، درباروں میں حاضری دینے لگے، بعد میں یہ رسم یہاں تک مقبول ہوئی کہ نوجوان بھی امراء کی ڈیوڑھیاں چومنے لگے، علم و ادب کے ایوان سونے ہو گئے اور شعر و ادب کی گونج کی جگہ یدم کی ہا و ہو نے لے لی۔ اس سے مجھے فائدہ ہوا اور میری افسری رنگ لانے لگی۔ نوجوان اور اساتذہ بھی ماتحتوں کے دوش بدوش حاضر ہوتے، داد سخن دیتے اور اپنے الو سیدھے کرتے۔

نوجوانی کے ساتھ ساتھ فکر و نظر میں وسعت ہوئی، تازہ جہانوں کی سیر کے لیے مختلف شیشوں کے ساتھ مجھے مختلف ممالک کی سیاحت پر جانا پڑا۔ جانے کا طریقہ آسان تھا: جس ملک میں جانا ہوتا اس کے علمی و تہذیبی سرمائے پر صحافتی مضامین لکھتا۔ اس کو

عظیم ظاہر کرتا اور پھر اس کے ساتھ اپنی گہری دلچسپی کا اظہار کرتا۔ گرگٹ کی طرح ذرا بھی رنگ بدلتے ہی دعوت ناموں کی بھرمار ہو جاتی اور اس طرح ادب کی خدمت کے نت نئے مواقع فراہم ہو جاتے۔

میرے عہد کے ادیب عظمتوں کے جھگڑوں میں اپنے آپ کو اتنا الجھائے رکھتے تھے کہ سوائے عظمت کے ہر چیز ان میں مل جاتی تھی۔ پڑھنے لکھنے کی بیماری جو کبھی وبا کی شکل اختیار کر چکی تھی کم ہوتی جا رہی تھی۔ بڑے ادیب وہ ہوتے تھے جو بڑی باتیں بنا لیتے تھے۔ لکھنے سے زیادہ اپنے آپ کو منوانے اور "ادب میں جمود ہے یا نہیں ہے؟" قسم کی بحثیں چلوانے کا رواج عام تھا۔

اب خزاں کا دور دورہ ہے۔ پرتے رخصت ہو رہے ہیں، ان منتشر خیالات کو اس لیے یکجا کر رہا ہوں کہ وہ شخصیات و واقعات جن سے میں متاثر ہوا تھا اور میری شخصیت کی نشوونما کو جنہوں نے ہوا دی وہ ماضی کی کتاب میں محفوظ ہو جائیں، عزت، دولت، شہرت، شخصیت اور ادب کی ان پرچھائیوں میں، اگر آپ کو ہلکا سا بھی عکس نظر آ جائے تو اسے "میں" کی جھلک سمجھئے گا۔ یہی وہ "میں" ہے جس نے اوروں کی طرح مجھے بھی اپنی "سوختہ خوانی" پر مجبور کیا اور یہ چند سطریں لکھوائیں۔ اگر ان پر آپ ایمان لے آئے تو میں آپ کے ایمان کے بارے میں سوچوں گا، اور اگر نہیں لائے تو آپ کے تنقیدی شعور کے بارے میں۔

مرزا ظاہر دار بیگ کافی ہاؤس میں

یہ پرانا کافی ہاؤس ہے۔

اسی کافی ہاؤس میں مجبوراً مجھے بڑے لوگوں سے بھی ملنا پڑا ہے۔

اسی کافی ہاؤس کے تاریک گوشوں سے میں نے دن دہاڑے پدرم سلطان بود کے رسیلے بول بھی سُنے ہیں۔

اسی کافی ہاؤس میں بیٹھنے والے تمام بڑے بڑے مسائل پر عموماً بے لاگ نکتہ چینی کرتے رہتے ہیں۔ جو کہ اکثر اس قدر کڑوی ہوتی ہے کہ اس میں چینی کا نام و نشان تک نہیں ہوتا البتہ نکتے زیادہ ہوتے ہیں۔

ایک دن میں اسی کافی ہاؤس میں بہت خوش خوش بیٹھا Eggplion thirtyfive کے سگریٹ پھونک رہا تھا، اتنے میں مجھے ایک کرسی کھسکتی نظر آئی، ایک نہایت ہی خوش پوش نوجوان آہستہ آہستہ میری طرف بڑھا، وہ ایک نہایت ہی بیش قیمت سوٹ پہنے

ہوئے تھا، اس کی بڑھیا گرگابی ریشم کا جوتا اس قدر چمک رہا تھا کہ میں بہ آسانی اس میں اپنی صورت دیکھ سکتا تھا۔ اس کی قیمتی ٹائی پر ایک سنہرا طلائی کراس دمک رہا تھا، اس کے بال بڑے بھلے لگ رہے تھے، بھورے بھورے گھونگریالے جن کی ایک لٹ اس کے ماتھے کے دائیں طرف آگے کو نکلی ہوئی تھی۔ اس کا چوڑا چکلا سینہ اور کسرتی بدن اس کی شخصیت کا ایک اچھا نمونہ تھا، سنہری کمانی کے شان دار چشمے کے پیچھے سے اس کی پُراسرار آنکھیں چمک رہی تھیں۔ دھیرے دھیرے وہ میرے بالکل قریب آگیا میں نے پہلو بدلتے ہوئے اس اجنبی نوجوان پر ایک نظر ڈالی۔ اجنبی نوجوان نہایت بے تکلفی سے بولا۔ "معاف کیجیے گا حضت میں بیٹھ سکتا ہوں؟" میں نے مسکرانے کی ناکام کوشش کرتے ہوئے جواب دیا "بیٹھیے۔" نو وارد مجھ سے نہایت گرم جوشی کے ساتھ بغل گیر ہو کر میرے سامنے بیٹھ گیا اور بولا۔ "تھینکس سر"۔

پہلے تو میں نے اپنی جیبوں کو اچھی طرح ٹٹول کر اطمینان کر لیا، میرا پرس اپنی جگہ پر موجود تھا، مجھے بلا وجہ وہ سُنی سنائی باتیں یاد آئیں کہ فلاں فلاں موقع پر لوگوں کی بھیڑ میں دھکا لگا یا، اچانک ان سے کوئی اجنبی آ بغل گیر ہوا کہ ایک عرصہ تک اس ملاقات کا صدمہ رہا۔ پھر میں نے دریافت کیا۔ "جناب کی تعریف"؟

"اوہ! معاف کیجیے گا۔ حضت میں آپ سے اپنا تعارف کرانا تو بھول ہی گیا۔ بندۂ ناچیز کو مرزا ظاہر دار بیگ کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔" مرزا ظاہر دار بیگ، یہ سن کر میں تقریباً اچھل سا پڑا، مجھے یاد پڑتا ہے کہ میں نے اس شخص کو اس سے قبل کہیں دیکھا ہے۔ ہو سکتا ہے کہ اس کا نام کہیں سُنا ہو، پھر مجھے خیال آیا کہ نہیں، یہ بات نہیں، اس کی تعریف تو ڈپٹی نذیر احمد مرحوم کی کتاب "توبۃ النصوح" میں پڑھی ہے۔

اس طرح میرا اس سے گویا غائبانہ سا ادبی تعارف تھا۔ میں نے دریافت کیا۔

"آپ ہی مرزا ظاہر دار بیگ ہیں، مجھے آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی مجھے حبیب پرویز کہتے ہیں، مگر مسٹر بیگ آپ تو سر سے بدل ہی گئے۔ یعنی آپ وہی مرزا ظاہر دار بیگ تو نہیں غالباً جن کا ذکر میں نے۔"

وہ میری بات کاٹتے ہوئے بولا۔ "جی ہاں آپ ٹھیک سمجھے، میں وہی مرزا ظاہر دار بیگ ہوں۔" میں نے حیرت سے آنکھیں پھاڑ کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اگر آپ وہی مرزا ظاہر دار بیگ ہیں تو مسٹر بیگ وہ آپ کی پرانی پوستین کیا ہوئی، آپ تو چہرے بشرے اور حلیے سے بالکل بدل چکے ہیں۔ معاف کیجیے گا حضرت وہ آپ کی ڈیڑھ حاشیے کی جوتی وہ سر پر دوہری بیل والی بھاری کامدار ٹوپی، وہ انگرکھے، وہ شبنم، بانات، اور ڈھاکے کے نینو وغیرہ کے طرحدار کپڑے، وہ کاشانی مخمل کی آصف خانی جس میں حریر کی سنجاف کے علاوہ گنگا جمنی کمخواب کی عمدہ بیل ٹکی ہوئی تھی، اور وہ آپ کا ٹھوکرے دو قدم آگے بات کرتا ہوا ڈھیلا پاجامہ جس کے ریشمی ازار بند میں گھٹنوں تک لٹکتا ہوا بے قفل کی کنجیوں کا گچھا، اور آپ کی طرحدار آڑی ترچھی اور بانکی ٹوپی، اب وہ سب کہاں؟ آپ یہ تو بتائیے آخر اتنے عرصہ غائب کہاں رہے جناب ——؟"

مسٹر بیگ نے قہقہہ مار کر ہنستے ہوئے کہا۔

"اوہ۔ ونڈر فل مسٹر پرویز۔ یہ تو آپ نے بڑے مزے کی بات پوچھی۔ ابھی کچھ ہی دن کی بات تو ہے کہ میرا یونیورسٹی ریلیڈ سے اچانک روم جانا ہو گیا، وہاں پاپائے روم نے مجھے سمجھایا کہ جب تم روم میں ہو تو ویسے ہی رہو جیسے روم والے رہتے ہیں۔ تو میں نے پاپا کی بات مان لی ——"

وہ بات کرتے کرتے رک گیا اور میرا پنُ اس نے میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ "سگریٹ سے شوق کیجئے مسٹر پرویز۔" "شکریہ" کہہ کر میں نے ایک سگریٹ نکال لی۔ پھر اس نے میرے ہی قیمتی لائٹر سے سگریٹ جلاتے ہوئے کہا۔۔"

"مسٹر پرویز، معاف کیجئے گا، آج کل بحالت مجبوری مجھ کو بھی ایسی گھٹیا سگریٹ پینی پڑ رہی ہے، اس وجہ سے میرا گلا خراب ہو گیا، مگر اب کیا کیا جائے مجبوری ہے جناب اس سے بہتر سگریٹ بھی تو یہاں نایاب ہے ورنہ میرے کے منھ تو Rechards fourTeens اور Reclando special لگی ہوئی ہیں —"

میرا منھ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ میں اس کی شخصیت سے بے حد مرعوب ہوا اور ڈرا کہ اگر میں کہیں اس کو اس وقت تھری فائیو سگریٹ پیش کرتا جو میں عام طور سے پیا کرتا ہوں تو یہ مجھے اپنے دل میں کتنا حقیر سمجھتا۔ جب شین تھرٹی فائیو کی بھینی بھینی خوشبو میرے دماغ میں بسی جا رہی تھی۔ میں نے سنبھل کر بیٹھتے ہوئے کہا۔ "مگر جناب اجب شین تھرٹی فائیو" تو نہایت اعلیٰ قسم کی سگریٹ ہے۔"

"اوہ۔ آئی ڈیا۔ پرویز صاحب کیا بتلاؤں یہ بھی وقت کی بات ہے کہ آپ اسے اعلیٰ سگریٹ شمار کریں، ورنہ اگر اس وقت میرا ریکارڈو اسپیشل سگریٹ" موجود رہتا تو آپ اندازہ کر سکتے کہ اچھے اور برے سگریٹ میں کیا فرق ہے۔ خیر قسمت کا لکھا۔۔۔۔۔۔ اب بتلایئے کہ کیا اس کافی ہاؤس میں بھی کوئی شریف آدمی بیٹھنا پسند کرے گا ـــ؟" اب میں نے اپنے جسم میں ایک لرزہ سا محسوس کیا۔

"مگر بیگ صاحب آپ کیا فرماتے ہیں۔ یہ تو یہاں کا سب سے بڑا کافی ہاؤس ہے بڑے بڑے لوگ یہاں آکر وقت گذارنے میں فخر محسوس کرتے۔ یہ تو یہاں کا سب سے

شاندار کافی ہاؤس ہے ـــــــ" مسٹر بیگ نے لاپرواہی سے ادھ جلا سگریٹ مسل دیا اور
پونزیبل کو حیرت سے بولے ـ" یہی آپ کے یہاں کا سب سے بڑا کافی ہاؤس ہے سرپرائزنگ!
ـــــــ بھلا سوچئے! کہ جو شخص ایسے ایسے کافی ہاؤس کا عادی ہو جہاں ایک وقت میں پچیس
پچیس ہزار آدمی سرو کرتے ہوں۔ جو شخص اپنی بہاریں سوئٹزرلینڈ کے امپریس کلب میں گزارتا
ہو بھلا اس کو یہ تنگ و تاریک کافی ہاؤس ذلیل نہیں لگے گا؟" میں نے تعجب سے پوچھا
ـــــــ امپریس کلب وہی تو نہیں جس میں شاہ فاروق، شاہ ایران اور سر آغا خان
وغیرہ ٹھہرا کرتے ہیں۔ اوہ مائی گڈنس، کیا ایسے ایسے کافی ہاؤس بھی اس دنیا میں ہیں جن
میں ایک وقت میں پچیس پچیس ہزار آدمی جمع ہو سکیں"ـــــ

ہاں ہاں مسٹر پرویز اس میں گڈنس کی کیا بات ہے، بلکہ اب جو نئے بن رہے ہیں
ان میں تو پچیس ہزار سے بھی زیادہ شرفاء جمع ہو سکیں گے۔ آپ نے آغا خان کا خوب
ذکر کر دیا۔ وہ میرے بڑے اچھے دوستوں میں سے ہے۔ میرے بغیر تو اس شخص کو جیسے چین
ہی نہیں پڑتا۔ بات یہ ہے کہ مجھے پولو کھیلنے کا بڑا شوق ہے اور آغا ہی ایسا شخص ہو
جو میرے سامنے ٹکا بھی رہ سکتا ہے۔ کھیلنے کو تو یہ فاروق بھی اچھا خاصہ کھیل لیتا ہے
مگر اب وہ بالکل پھکڑ ہو گیا ہے میں اسے زیادہ منھ نہیں لگاتا، فاروق کو دعوتیں دینے
کا بڑا شوق ہے، جب میں اپنے مخصوص چارٹرڈ پلین پر مصر جاتا تھا تو ہم دونوں مل کر ہفتوں
سیر و شکار کرتے۔ ویسے رضا بھی اچھا ہی آدمی ہے مگر ایران کی بات یہ ہے کہ اس کو
ٹھیک سے بات کرنے کا ہی سلیقہ نہیں۔ ابھی پچھلے ہی x mass کا قصہ ہے کہ
میں جنائر کیبری کی سیاحی میں مشغول تھا، وہاں کوئن الزبتھ نے مجھے ٹرنک کال کیا کہ
بے میری طالب علمی کے زمانے کی دوستی ہے جواب تک چلی آ رہی ہے اور ہے بھی بڑی وضعدار

عورت۔ اس نے بڑی عاجزی سے درخواست کی "ڈیر بیگ کیا تم میری سال گرہ کے موقع پر مجھے وش کرنے نہیں آؤ گے" ؟ میں نے ٹالنا چاہا کہ میں ان دنوں سر ونسٹن کے ساتھ لکڑ بگھے کے شکار میں بزی ہوں۔ بات یہ ہے کہ سر ونسٹن کمبخت سوائے میرے کسی اور کے ساتھ کھیلتا بھی نہیں اس کا قول ہے کہ یہ شکار یا تو بیگ کے وطن میں ہو سکتا ہے یا پھر کیمبری کے سبزہ زاروں میں، مگر صاحب ملکہ نے "میرے اچھے بیگ کیا تم نہ آؤ گے" کی رٹ لگا کر سب گڑبڑ کر دی اور سر ونسٹن شاید مجھے روکنے میں کامیاب بھی ہو جاتا اگر ملکہ کا اسپیشل ڈکوٹا نہ آ جاتا۔ ہاں صاحب تو بات کہاں کی کہاں پہونچی، میں یہ کہہ رہا تھا کہ اس فنکشن میں یہ کمبخت رضا بھی موجود تھا۔ میری تو خاک سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آدمی آخر حکومت کیسے کرتا ہوگا۔ تراب دھیرے۔ لگا عوام عوام چلّانے۔ اس موقع پر اتفاق سے پریسیڈنٹ ہاور بھی موجود تھے۔ موصوف نے اس کو آنکھوں آنکھوں میں اشارے بھی کیے پر وہ خاک نہ سمجھا۔ کہنے لگا یار و میرے ملک میں ایک عجیب ہنگامہ برپا ہے، عوام تیل کی صنعت کو نیشنلائز کرنا چاہتے ہیں۔ میں نے کچھ کہنا چاہا مگر خاموش ہو گیا۔ کسی زمانے میں سنا تھا، پڑھو فارسی اور بیچو تیل۔ مجھے اسی پر درب کا خیال آیا۔ اس کی واہی تباہی باتیں سن کر ہم لوگوں سے ضبط نہ ہو سکا اور ہنس دیے۔ موسیو شومان بولے۔ "آپ خود بیانات دینے کی زحمت کیوں گوارا کرتے ہیں؟ آخر یہ مِس سکریٹری کس مرض کی دوا ہوتا ہے؟ پھر ہم سب نے مل کر سمجھایا گر کچھ لارڈ ٹبلر ٹیلر بڑا پرانا گھاگ ہے۔ وہ رضا کو کسی بہانے سے باہر لے گیا تب جا کے کہیں نجات ملی۔ اس پر بھی سارا مزا تو کرکرا ہو چکا تھا۔ لارڈ ٹبلر ٹیلر کو تو تم جانتے ہی ہو گے دوسری عالم گیر جنگ میں اس کا اہم رول رہا ہے۔ بڑی پیاری ریس کھیلتا ہے جناب۔ آغا خان کا تو اس نے ناک میں دم کر رکھا ہے۔ آدمی کیا ہے چھلاوہ ہے چھلاوہ اسی لیے

تو ہم لوگ اس کو فری لانسر بھی کہتے ہیں۔ اتنے عرصہ میں مسٹر بیگ جن کی شخصیت میرے لیے اور بھی پر اسرار ہو چکی تھی، ایک لمبی آہ کھینچ کر ایک اور سگریٹ سلگانے لگا، میں نگاہ نیچی کیے ایش ٹرے میں ادھ جلے سگریٹوں کو گننے کی ناکام کوشش کر رہا تھا۔ بیگ اس وقت نہایت پیارے انداز میں دھوئیں کے حلقے بنا بنا کر فضا میں بکھیر رہا تھا۔ اس کی چین اسموکنگ کی وجہ سے فضا میں سگریٹ کی بھینی بھینی خوشبو بس گئی تھی۔ سگریٹ کا ٹن جو اس کے آنے سے قبل میں نے خریدا تھا اب تقریباً خالی ہو چکا تھا، وہ میز پر رکھے ہوئے "اون لکر" اور "ٹائمس آف انڈیا" کے تازے پرچے غور سے دیکھ رہا تھا۔ پھر "فلمس انڈیا کو اٹھا کر کہنے لگا اچھا تو آج کل بابو راؤ پٹیل فلمس انڈیا نکال رہا ہے، ظالم نے بڑا اچھا پرچہ نکالا ہے اوہو، اشوک بھی موجود ہے، کمبخت بہت موٹا ہو گیا ہے۔" میں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔ "آپ ان دونوں کو جانتے ہیں؟"

"ہاں میں ان دونوں کو جانتا ہوں۔ بابو راؤ سے میری ملاقات لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے آکسفورڈ میں کرائی تھی۔ ان دنوں لارڈ کو خبط سوار تھا کہ مجھے زیادہ سے زیادہ ہندستانیوں سے ملوایا جائے۔ بات یہ تھی کہ ایک دن کاک ٹیل پارٹی میں کہیں میں نے موصوف سے مذاق میں کہہ دیا تھا کہ "آج کل میری طبیعت بہت گھبرا رہی ہے، شاید میں انڈیا واپس چلا جاؤں۔" لارڈ نے اس بات کو بہت ہی سیریس لی۔ ٹیک اپ کیا۔ اس دن سے بیچارا ایکڑ پکڑ کر ہر ہندستانی سے ملوانا۔ یہ اشوک تو ان دنوں اتنا موٹا نہ تھا۔ سر جان ہنٹر نے مجھے اشوک سے ملواتے ہوئے کہا تھا۔ "بیگ ان سے ملو۔ یہ ہیں ہندوستان کے مایۂ ناز کریکٹر ایکٹر اشوک کمار۔" پھر انڈیا ہاؤس میں اکثر شامیں ہم دونوں نے ایک ساتھ گزاری ہیں۔ بڑا دلچسپ آدمی ہے۔ میں نے ان ہی دنوں اس کا ٹیلی وژن پر ایک شو بھی کرا دیا تھا جس کا آج تک

احسان مانتا ہے، اچھا ہوا تم نے یاد دلا دیا، لوٹتے میں اس سے بھی مل لوں گا۔ کیا میں یہ تصویریں چاک کر سکتا ہوں۔ میرے دوست کی افسوس کہ میرے پاس ایک تصویر بھی نہیں"۔

"نہیں نہیں مسٹر بیگ۔ آپ یہ تصویریں کیا پورا پرچہ لے لیجئے، اس میں آپ کے دوستوں کی تصویریں ہیں میں دوسرا خرید لوں گا۔" اس نے شکریہ کہہ کر فلم انڈیا اٹھا لیا پھر اودن لکھر کو الٹ پلٹ کر دیکھنے لگا۔

"اوہو مسٹر کیوریز اس میں تو کمبخت سب اپنے ہی موجود ہیں۔ ریتا بڑی شیطان ہے علی بیچارے کو تو اس نے نگنی کا ناچ نچوا دیا۔ اچھا ڈاکٹر مہجبد اور ہیڈی لیمار بھی موجود ہیں کیا دن تھے وہ بھی جب میں ہالی ووڈ میں انہی لوگوں کے ساتھ سیر و تفریح کیا کرتا تھا۔ ان دنوں یہ لوگ "سامسن اینڈ ڈیلائیلا" تیار کر رہے تھے۔ اچھا یہ چارلی ابھی زندہ ہے۔ بڑا نانی ہے نانی۔ یہ وریز صاحب۔ ایک دن ہم لوگ مون لائٹ پکنک پر جا رہے تھے کہ چارلی صاحب کو شکار کی سوجھی۔ کہنے لگے کہ جنگل جنگل چلیں گے اور واپسی پر ٹیولائٹ پکنک کریں گے، صاحب اڑ گیا اپنی بات پر، غضب کا ضدی ہے، تعریف جناب کی یہ کہ بائیں ہاتھ سے موٹر چلائیں گے اور بائیں ہی ہاتھ سے سگریٹ بھی پئیں گے، داہنا ہاتھ پتلون کی جیب سے باہر نہیں نکالیں گے، پھر کیا مجال کہ جناب کو کوئی ایکسیڈنٹ نام کو بھی ہو جائے"۔

بات کرتے کرتے وہ رک گیا۔ شاید وہ کوئی گزری ہوئی بات یاد کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ پھر بولا۔

"یہ وریز صاحب یہ اودن لکھر آپ مجھے دیں یا نہ دیں مگر یہ میں لے جاؤں گا"۔

"ہاں ہاں آپ شوق سے لے جائیے یہ آپ ہی کا ہے"۔

میں نے اودن لکھر اس کی طرف بڑھا دیا۔ اتنے میں بیرا بل لے آیا مسٹر بیگ

نے بیرے کے ہاتھ سے بل جلدی سے چھین لیا۔ اب مجھ میں اور مسٹر بیگ میں کافی بل ادا کرنے پر کشمکش ہونے لگی۔ میں چاہتا تھا کہ بل میں ادا کروں، اور وہ کہتا تھا کہ نہیں میں خود ادا کروں گا۔ اتنے میں اس نے بیرے سے کہا پانی لے آؤ۔ بیرہ چلا گیا۔ اور وہ جھنجھلا کر بولا — "یہ دیرز صاحب یہاں کے بیرے بڑے بدتمیز ہیں۔ آکر سر پر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ آخر گڈ ول بھی تو کوئی چیز ہوتی ہے۔ سوئٹزر لینڈ میں تو بیرے اس قدر سدھے ہوئے ہوتے ہیں کہ اشاروں پر سروس کرتے ہیں۔ وہ پھر بات کرتے کرتے رک گیا اور پریشانی کے عالم میں سگریٹ سلگا کر ٹائمز آف انڈیا کے ورق الٹنے لگا۔ میں نے دریافت کیا۔

"آپ نے آج کا اخبار نہیں دیکھا۔" "آج فرصت ہی کہاں ملی۔" "پھر دیکھ لیجئے نا۔" "مگر وقت کہاں ہے، حالانکہ آج ایڈیٹوریل غضب کا لکھا ہے۔ اس کو دیکھوں گا ضرور، لکھتا خوب ہے ظالم۔"

"تو پھر لیتے جائیے نا۔" "مگر آپ" "اوہ آپ میری فکر نہ کیجئے۔"

اب میں اس کی شخصیت سے اس قدر مرعوب ہو چکا تھا کہ مجھ میں احساس کمتری پیدا ہونے لگا جو میری فطرت کے خلاف تھا۔ چنانچہ میں نے اس کو تنگ کرنے کے لیے پچھلی باتیں کریدنا شروع کیں —

"مسٹر بیگ معاف فرمائیے گا۔ اپنی ایک غلط فہمی دور کرنا چاہتا ہوں۔ کیا یہ حقیقت نہیں کہ جب غریب کلثم آپ کے بل بوتے پر اپنا گھر بار چھوڑ کر آپ کے پاس آیا تو آپ اس کو ایک رات ٹھہرا بھی نہ سکے بیچارے کلثم کو ویران مسجد میں ٹھہرایا اس کو شدت بھوک میں مٹھی بھر چنے کھلا کر ٹالا۔ صبح کو اسے پولیس کے حوالے کر دیا۔ آپ نے

تو ظاہر کیا تھا کہ جائداد کی قسم کی کوئی ایسی چیز نہیں جو آپ کے پاس نہ ہو۔ لیکن اصلیت یہ نکلی کہ جس عالی شان حویلی کو آپ اپنا بتلاتے تھے اس کے پیچھے اپلوں والی ٹال کے برابر جو کچا مکان تھا اور جس کے نہ صرف بیشتر چھپر غائب ہو چکے تھے بلکہ ان میں اس قدر گنجائش نہ تھی کہ ایک شخص کو آپ رات بھر کے لیے ٹھہرا سکیں اسی کے اندر سے آپ برآمد ہوئے تھے۔ میں پوچھتا ہوں کہ آپ نے کیا غلط بیانیوں سے کام نہیں لیا؟"[1]

میرا خیال تھا کہ وہ میرے ان تابڑ توڑ حملوں کی تاب نہ لا سکے گا، مگر میری حیرت کی انتہا نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ وہ مستقل مسکرا رہا تھا وہ ہنستا ہوا بولا۔

"اوہ مسٹر پریذیڈنٹ آپ تو ذاتیات پر اتر آئے، خیر اگر آپ دریافت کرتے ہیں تو میرے بیان کر دینے میں چنداں مضائقہ نہیں۔ بھلا غور کرنے کی بات ہوئی کہ میرا ایسا پالشڈ اور کلچرڈ آدمی یہ کرے گا؟ آپ یوں سمجھ لیجئے کہ مانا کلیم میرا دوست تھا، مگر یہ اس کی بڑی خراب عادت تھی کہ بات بات پر جب دیکھو کلیم صاحب گھر سے بگڑے چلے آ رہے ہیں۔ یعنی جناب، اس شخص نے اس معاملہ میں بچوں تک کو مات کر دیا تھا۔ آخر میں ان کا کوئی دشمن تھا جو ان حضرت کی گھر سے بھاگنے کی عادت کو انکریج کرتا۔ اول تو دس دجہ سے میں نے ان حضرت کو "نو لفٹ" پر اڑا دیا۔ دوسرے میں ان کے گھر والوں سے اپنے ٹرمس خراب نہیں کرنا چاہتا تھا، پھر جس رات کلیم گھر سے بگڑ کر میرے یہاں آیا، اف میرے معبود! وہ رات میرے اوپر کس قدر سخت تھی۔ ایک تو کلیم جیسے دوست کی پریشانی، پھر بندے کے گھر میں عشق کے دورے پڑ رہے تھے۔ میری تو جان پر بنی ہوئی تھی، وہ بے زبان کلیف

---

[1] ڈپٹی نذیر احمد کے ناول "توبۃ النصوح" میں مرزا ظاہر دار بیگ کے کردار کے ساتھ یہ واقعات درج ہیں۔

میں تڑپ رہی تھی، پھر کلیم کی پریشانی، آخر یہ بات میں نے کلیم پر بھی تو صاف کر دی تھی کہ اگر مجھ پر اس کو سخن سازی کا احتمال ہے تو سخت تعجب کی بات ہے اتنی مدت مجھ سے اور اس سے صحبت رہی مگر افسوس کہ اس نے میری طبیعت کو نہیں پہچانا۔
یہ ٹھیک ہے کہ میں کچے اور بوسیدہ مکان میں مقیم تھا جس کا سبب میری مالی حالت نہیں تھی۔ سمجھنے والوں نے غلطی کی۔ مگر ان دنوں کچھ میں پرولتاری رنگ میں رنگ گیا تھا۔ یعنی میں اس زمانے میں ڈی کلاس ہو گیا تھا اور سیاسیات میں بہت دلچسپی لیتا تھا۔ شاید آپ اعتراض کریں کہ اس زمانے میں تو کوئی ایسی سیاسی تحریک نہ تھی۔ لیکن اس کے بارے میں آپ کو پھر تفصیل سے تلاؤں گا۔ ہاں تو میں نے سوچا کہ اشتراکیت کا بہت قریب سے مطالعہ کیا جائے جس کے لیے ضروری تھا کہ تکلیفیں برداشت کروں اور پیارے عوام سے زیادہ سے زیادہ قریب رہوں اور ان کی اسٹڈی کروں، وہ کیا کھاتے ہیں، کس طرح رہتے ہیں، ان کے مسائل کیا ہیں۔ اور ان کی تکالیف کو کس طرح حل کیا جا سکتا ہے۔ تو جناب میں نے خدمت خلق کے چکر میں تو گھر بار کیا دنیا بھر کی جاگیر کو ٹھوکر مار دی۔ اور یار لوگ بات کہاں سے کہاں لے اڑے۔ آپ جناب یہ باتیں کیا سمجھیں، کوئی میرے دل سے پوچھے کہ میں نے کلیم کو ویران مسجد میں کیوں ٹھہرایا تھا۔ تو ویران، اجاڑ اور سنسان مسجد میں ٹھہرانے کی وجہ نہایت معقول تھی۔ چونکہ کلیم خدا کی ذات سے منکر تھا اور میں نے سوچا کہ ویرانی اور مایوسی میں بڑے بڑوں کو خدا یاد آ جاتا ہے۔ چنانچہ جناب میں نے دل کو کڑا کر کے اس کو خانۂ خدا میں پناہ دی تاکہ اس کی آنکھیں اب بھی کھل جائیں اور صبح صبح میں قطب صاحب سدھارا کہ جا کر اس کے واسطے دعائے خیر کروں، مگر یار لوگوں نے اس میں بھی زمین و آسمان کے قلابے ملادیئے

اور باقی رہا جہاں تک چھدامی بھر بھبھنے کے چنوں کا ذکر تو پھر جناب یہ کلیم کی خود لت تھی اور اس کی مرغوب الطبع غذا تھی، وہ ہفتوں سوائے چھدامی کے لذیذ چنوں کے اور کچھ کھاتا ہی نہ تھا۔ ہاں مرزا زبردست بیگ نے جو کچھ کیا وہ بہت بُرا کیا۔ مگر بھائی اس کی برائی اس کے ساتھ، میری نیکیاں میرے ساتھ، مرزا زبردست بیگ بڑا ماتی ہے میں خود اس سے بڑا سخت عاجز ہوں، اس کو لاکھ بار سمجھایا کہ بھائی کچھ تو میری پوزیشن کا خیال کیا کرو، ہر جگہ خواہ مخواہ میں میرا اسکینڈل کرواتا پھرتا ہے۔ ابھی حال ہی کا تو ذکر ہے۔ زبردست بیگ کو اسٹیٹس امریکا سے بنایا جانا تھا، کہنے لگا کہ پیدل کر اس کروں گا، اور اڑ گیا اپنی بات پر، اب آپ ہی بتلایئے۔ ساری خدائی ایک طرف اس کی خدائی ایک طرف، صاحب نام کا بھی بڑا اثر ہوتا ہے۔ اتنی عمر اس کی ہونے کو آئی مگر سنجیدگی نام کو نہیں، لاکھ بار سمجھایا کہ بھائی اب تو اپنی عمر طبعی کو پہونچ گیا ہے کچھ تو سیریس ہو جا۔ مگر نہیں، اس پر طرہ یہ کہ آج کل اس قدر بڑے اور ذمہ دار عہدے پر فائز ہیں۔ مجھے تو ڈر لگتا ہے کہ کہیں یہ بدعنوانیاں اور لڑکپن رنگ نہ لائے۔ برخوردار آج کل بی بی سی کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔"

میں نے حیرت سے پوچھا ــــ "ہیں۔ بی بی سی کو ایڈٹ کر رہے ہیں۔ آخر وہ کس طرح؟" ــــ "جی ہاں! ایڈٹ کر رہے ہیں۔ ابھی پارسال کی تو بات ہے۔ میں مسٹر گورکی کے ساتھ ڈکس کے شکار کو گیا ہوا تھا، وہیں پہ زبردست بیگ سے ملاقات ہو گئی۔ اس میں حیرت کی کیا بات ہے، اب تو وہ کافی تندرست ہو گیا ہے۔" میں حیرت سے آنکھیں پھاڑتا ہوا تقریباً اچھل سا پڑا۔ میں نے سخت حیرت کے عالم میں چلا کر پوچھا۔ "آپ پارسال گورکی سے ملاقات ہوئی تھی، آخر وہ کیسے؟" ــــ "جی ہاں! پچھلے ہی سال

کی تو بات ہو۔ مسٹر گورکی تو میرے بڑے اچھے دوستوں میں سے ہیں۔" "مگر جناب گورکی کو تو مرے ہوئے بھی ایک مدت ہو گئی۔" "اوہ! وہ تو آپ بڑے گورکی کی بات کر رہے ہیں۔ مگر میں جن گورکی کا ذکر کر رہا تھا وہ غالباً اس کے چھوٹے بھائی ہیں۔ پھر میرا مطلب یہ ہے کہ ابھی وہاں پر بہت سے گورکی ہیں۔" "مگر حضرت گورکی کے تو کوئی چھوٹا بھائی نہ تھا۔" "اوہو! آپ بات کہاں سے کہاں لے اڑے۔ ہمیں گورکی یا اس کے چھوٹے بڑے بھائی سے کیا مطلب۔ بات یہ ہے کہ وہ ہر وقت گورکی کی تعریف کیا کرتا تھا تو ہم لوگ اسے پیارے گورکی گورکی پکارنے لگے۔ جناب ڈکس کا نہایت ماہر شکاری ہے۔ تین دفعہ تو اس کا انعام جیت چکا ہے۔" "جناب ڈکس کے شکار پر اس کا انعام کیا مطلب؟" "ارے واہ صاحب، آپ کیا سمجھیں یہ سب آہنی پردے کے پیچھے کی باتیں ہیں۔ پھر اس نے آخر یانسی کے علاقے میں آدم خور ڈکس مار مار کر امن بھی تو قائم کر دیا تھا۔" وہ سگریٹ نکال کر سلگانے لگا۔ مجھے اس کی باتوں میں اس قدر لطف آ رہا تھا کہ میں اس کو خاموش دیکھ کر اداس ہو گیا۔ میں نے پھر باتوں کا سلسلہ چھیڑنے کے لیے پوچھا۔

"آپ ٹھہرے کہاں ہیں؟"

"اوہ میں کیا بتاؤں میں کہاں پر ٹھہرا ہوا ہوں۔ جب سے آیا ہوں تمام والیان ریاست بندے سے خفا ہیں۔ ہر ایک یہی چاہتا ہے کہ میں اس کے یہاں ٹھہروں، صاحب ایک جان ٹھہری اور ہزاروں بلاوے۔"

"مگر مسٹر بیگ آپ نے یہ تو بتلایا نہیں کہ آخر آپ کرنے کیا ہیں۔"

"قبل اس کے کہ وہ میری بات کا کچھ جواب دیتا بیرا پھر دوبارہ بل لے کر آ گیا۔

اس کو خاموش دیکھ کر میں نے دریافت کیا۔ "کیا ہوا"۔ وہ بڑے فکر مند لہجے میں بولا۔
"لے گیا بھائی کوئی چوٹ، کچھ نہیں ہوتا گیا۔ کسی نے میرا پرس نکال لیا۔ اس میں تقریباً
تیس ہزار روپیہ تھا، پھر اس نے جیب سے چیک بک نکال کر دیکھی اور کہنے لگا اُف
چیک بک بھی ختم ہو گئی، اب کیا ہوگا۔ آج ہفتہ ہے، کل اتوار، پیر کو بنک ہالی ڈے
ہے۔ میں تو کہیں کا بھی نہیں رہا۔ سب بنا بنایا پروگرام اَپ سٹ ہو جائے گا۔" یہ کہہ کر
اس نے Chase Manhattan بنک کی پاس بک نکالی۔ دنیا کا سب سے بڑا بنک کی پاس بک
اس کے ہاتھ میں تھی۔ میں نے ہمدردی کرتے ہوئے کہا۔ "معلوم ہوتا ہے کہ کسی گرہ
کٹ نے آپ کا پرس نکال لیا، مگر اس میں پریشان ہونے کی کیا بات ہے، میرے لائق
جو خدمت ہو بندہ حاضر ہے"۔ وہ بولا۔ نہیں آپ کا بہت بہت شکریہ۔ روپیہ کی
تو کوئی بات نہیں ابھی تو Chase Manhattan بنک میں چار پانچ لاکھ روپیہ پڑا ہے۔ مگر بنک تو
منگل سے پہلے کھلنے کا نہیں، ویسے للّہ میں آپ کو پرامیسری نوٹ لکھ دوں"۔
مگر میں نے برا مانتے ہوئے کہا۔ "آپس میں کہیں لکھا پڑھی ہوتی ہے۔ آپ کو کس قدر
روپے کی ضرورت ہے"۔ "ویسے تو اندازاً پانچ سو میں کام چل جائے گا۔ تین دن
کی تو بات ہی ہے، مگر بہت کفایت شعاری سے کام چلانا پڑے گا"۔ اور میں نے اس کو پانچ سو
گنی دیئے۔ میں نے سوچا کہ اگر میری ایک مہینے کی تنخواہ کا ایک حصہ ایک شریف آدمی
کے کام آجائے اور وہ اتنا بڑا آدمی اس حقیر رقم کی وجہ سے میرا احسان مند رہے تو
اس سے اچھی بات کیا ہو سکتی ہے۔ روپیہ پیسہ بھی اسی دن کے لیے ہوتا ہے اتنے میں
مجھے خیال آگیا، بیرا بڑی دیر سے بل لیے کھڑا ہے۔ مسٹر بیگ خاموشی سے سر جھکائے
بیٹھے تھے میں نے بل ادا کر دیا۔ بیگ نے مجھے اپنا فون برائے احتیاطاً نوٹ کروا دیا۔

اور اصرار کر کے وعدہ لے لیا کہ اگر اتفاق سے میں منگل کو فون کرنا بھول جاؤں تو تم مجھے خود ہی فون پر یاد کر لینا۔ یکایک وہ فکر مند ہو کر اٹھا اس نے اپنی کلائی پر نظر ڈالی۔ اس کی سنہری گھڑی چمکنے لگی۔ وہ بولا۔ اُف ٹائم کافی ہو گیا ہے اب چلنا چاہیے، پھر ملاقات ہو گی اچھا پھر ملیں گے۔ چیریو پاس۔" پھر وہ فلمس انڈیا، اون تحر اور ٹائمز کے تازہ پرچے بغل میں دبا کر چلنے لگا۔ میں اس کو چھوڑنے کے لیے باہر پورٹیکو تک گیا۔ میں نے اس سے کہا۔ "لائیے میں آپ کو اپنی گاڑی پر چھوڑ آؤں۔" وہ قہقہہ مار کر ہنس دیا۔ "ویری ویری تھینکس۔ آخر موٹر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے پاس بھی ایک چھوڑ تین تین گاڑیاں ہیں، مگر مجھے آج کل ڈائیبٹیز کی سخت شکایت ہے۔ ڈاکٹرس کا مشورہ تو یہی ہے کہ اگر آپ پیدل نہ چلے تو آپ کی صحت گر جائے گی، پھر آج مجھے پیدل چلنے کا موقع کہاں ملا۔ دیکھیے نا۔ ادھر پیدل چلنے کے باعث میری صحت کس قدر بہتر ہو گئی ہے۔ اچھا۔ بائی بائی ۔۔ بائی بائی ۔۔" اور وہ مجھ سے ہاتھ ملا کر پھرتی سے تیز تیز چل کر گنج کے ہجوم میں غائب ہو گیا۔۔

اچانک کافی ہاؤس کے منیجر نے میرے کندھے پر ہاتھ رکھ دیا۔ میں نے مڑ کر دیکھا۔ وہ بولا۔ "معاف کیجیے گا۔ آپ کی پاس بک ٹیبل پر ہی رہ گئی تھی۔" شکریہ کہہ کر میں نے پاس بک اس سے لے لی۔ منیجر چلا گیا۔ میں نے سوچا کہ ابھی جب مسٹر بیگ کو احساس ہو گا کہ پاس بک رہ گئی ہے تو وہ دوڑا ہوا آئے گا۔ میں اس کے انتظار میں بڑی دیر تک کھڑا رہا۔ وقت گزاری کے لیے میں نے پاس بک کھولی کہ دیکھوں کتنی زبردست رقم اس کی بینک میں جمع ہے۔ اوپر جلی حروف میں لکھا ہوا تھا۔ Layds Bank انڈیا برانچ۔

ادھر میں ایک دم اچھل پڑا، جیسے کسی بچھو نے اچانک ڈنک مار دیا ہو۔ میری حیرت کی انتہا نہ رہی۔ اُف خدایا۔ باہر سے تو وہ پاس بُک تھی اور اندر سے فلمی گانوں کی ڈائری۔

بھیم پلاسی بھیم...... تقدیر سے تدبیر بنالے...... لارے لپا......

آج کل کے جنٹل مین۔ خالی جیب مہنگے نین...... درد کا ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

تہمتیں چند اپنے ذمے دھر چلے
جس لیے آئے تھے سو ہم کر چلے

میں نے جل کر غصے میں بیاض نما پاس بک بند کر دی اور ٹیلی فون کرنے کے لیے ڈائل گھمایا تو پتہ چلا کہ وہ نمبر فائر بریگیڈ کا تھا۔ مگر فائر بریگیڈ والے دل کی آگ کیسے بجھا سکتے تھے۔ میں آدمی ہوں کوئی مکان تو نہیں۔

میری بہن کی سہیلیاں

شاید آپ کہیں "اور بیوی کی سہیلیاں" تو میں کہوں گا کہ مجبوری یہ ہے کہ شادی نہیں ہوئی ہے ورنہ دیگر شادی شدہ حضرات کی طرح میں بھی بڑے رعب سے بات اپنی بیوی سے شروع کرتا۔

میں اپنی بہن اور اُن کی سہیلیوں کا تو نام بھی لے سکتا ہوں، مگر بیوی کے ہوتے ہوئے پھر یہ ممکن نہ رہتا اور اُن نے کہا "اجی سنتی ہو" میں کہتا ہوں "آخر تم کو ہو کیا گیا ہے!" "وہ بولیں کیا کہتے ہو" قسم کا مضمون ہو چکا ہوتا۔ اور اگر کہیں دو چار برساتیں جھیل چکا ہوتا تو یہ مضمون ہوتا۔ "وہ تو منے کو لے کر زنانہ پارک گئی ہیں اور میں گھر رکھا رہا ہوں" یا "ڈاکٹر کے یہاں تو تم نے سارا دن لگا دیا جی، مگر اس وقت بیوی کے مرثیے اور قصیدے کی نہ گنجائش ہے اور نہ ضرورت ورنہ سارا مضمون شیخ چلی

کی پلاننگ بن کر رہ جائے گا۔

ہاں تو قدرت نے مجھے نصف درجن بہنیں عطا کر رکھی ہیں۔ اب اسے کیا کیا جائے کہ یہ سب کی سب میری نہایت شدید قسم کی آپائیں واقع ہوئی ہیں۔

اگر بات آپا ہونے تک رہتی تو غنیمت تھا۔ مگر مشکل یہ آن پڑی کہ یہ سب کی سب بے حد سوشل واقع ہوئی ہیں۔ یہ بات شاید آپ کو کچھ عجیب لگے۔ مگر میں عرض کروں گا کہ ان سب کی لاتعداد سہیلیاں واقع ہوئی ہیں۔ ٹریجیڈی کی بات یہ ہے کہ میری پانچ بہنوں کی شادیاں خدا کے فضل و کرم سے بڑے دور دراز مقام پر ہو گئیں۔ اب رہیں ایک صاحبہ جو ہنوز زیر تعلیم ہیں اور انھوں نے ان تمام سہیلیوں کو سمیٹ لیا ہے ان سہیلیوں کے بارے میں جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے وہ صرف اتنی کہ نہ ان میں سے کسی کی آج تک شادی ہوئی ہے نہ کسی کے والدین کا تبادلہ ہوا نہ کبھی کوئی کسی حادثہ کا شکار ہوئی۔ نتیجہ کے طور پر جس طرح اکثر کمزور دل حضرات کے یہاں مہمانوں کا تانتا لگا رہتا ہے۔ اسی طرح میرے گھر میں میری بہن کی سہیلیوں کا جمگھٹا لگا رہتا ہے۔ جن کی آمد و رفت سے اکثر حضرات میرے گھر کو گرلز کالج تک سمجھ بیٹھے ہیں۔ اگر گھر کرایہ کا ہوتا تو اسے تبدیل کر کے دور رہنے کا خیال بھی دل میں لا سکتا تھا۔ مگر مصیبت یہ ہے کہ گھر ذاتی ہے، اور یہ سہیلیاں نہ صرف میری آپائیں بن گئی ہیں بلکہ مجھ پر ہر قسم کے شکوک کا اظہار بھی کرنے لگی ہیں۔ مجھے قدم قدم پر ٹوکتی ہیں۔ ادھر میں نے باہر جانے کے لیے لباس تبدیل کیا اور سوچا ذرا کلب یا کافی ہاؤس کی جانب نکل جاؤں اور ان سہیلیوں میں سے کسی ایک نے نصیحت کرنا شروع کر دی۔

"کیجئے جناب! یہ بال وغیرہ بنا کر کہاں چل دیئے۔ آج کل آپ کا

دل گھر میں ذرا کم لگتا ہے۔"

قبل اس کے کہ میں ان کی بات کا کوئی معقول جواب دے سکوں کہ ان میں سے دوسری فرماتی ہیں:۔

"یہ شیو کیوں بڑھا رکھا ہے۔ کیا آج کل شاعری شروع کر دی ہے آپ نے؟ اب آپ شاعروں میں بیٹھنے لگے ہیں۔"

تیسری کہتی ہیں:۔

"اگر یہی لچھّن ہیں تو کہیں ڈھنگ کی لڑکی بھی نہ جڑے گی۔"

اب میں ان کے سامنے منھ یوں نہیں کھول سکتا کہ بقول میری آپا کے، ان میں سے کوئی ایسی نہیں ہے جس نے بچپن میں تمھاری کان گوشی نہ کی ہو۔ یا مرغا نہ بنایا ہو بلکہ اکثر نے تو ایک ٹانگ پر گھنٹوں کھڑے رہنے تک کی سزا دی ہے۔ چنانچہ لاجواب ہو کر سر جھکائے گھر سے نکل جاتا ہوں۔

دیر یا سویر وہ وقت آ ہی جاتا ہے جب میں ضرورتاً یا مجبوراً گھر کا رُخ کرتا ہوں اس وقت مجھ سے عمر میں کم مگر آپا کی سہیلیاں پھر میری ٹانگ لیتی ہیں۔ اور میں جل تو جلال تو کا وظیفہ پڑھتا ہوا گھر میں داخل ہوتا ہوں۔ اس وقت یہ سہیلیاں میرے اوپر سوالات کی بوچھاڑ کر دیتی ہیں۔ گھر اس لیے اور بھی جلد آجاتا ہوں کہ ان تمام سہیلیوں کو ان کے گھر پہونچانے کا کام بھی مجھے ہی انجام دینا پڑتا ہے جبکہ یہ سہیلیاں شہر کے مختلف حصوں میں آباد ہیں۔ ان میں سے اگر کوئی دیر سے گھر پہونچے تو ان کی تمام ذمہ داری بھی میرے ہی سر رہتی ہے۔

"آج بڑی دیر لگا دی۔ کہاں تھے اب تک جی؟"

یہ گویا پہیلی کے والدین میں سے کوئی پوچھ بیٹھتا ہے جیسے میں بھی کوئی چپراسی یا کمہار وغیرہ واقع ہوا ہوں۔

میرے گھر پر ان پہیلیوں کا جادو بیجا قبضہ ہے۔ میرے کمرہ کی جھاڑ پونچھ ترتیب و صفائی پر یہ قابض ہیں۔ عموماً جب میں یونیورسٹی یا اپنے رسالے کے دفتر سے لوٹتا ہوں تو کچھ اس قسم کے جھگڑے اٹھ کھڑے ہوتے ہیں۔

"کیوں صاحب یہ آپ کے سرہانے سے ماچس کیسے برآمد ہوئی؟"

"کہیں سگریٹ یا بیڑی تو نہیں پینے لگے؟"

چنانچہ جواب دیتے دیتے سویرا ہو جاتا ہے۔ رائے عامہ کو ہموار کرنا آسان نہیں ہوا کرتا۔ پہیلیاں بھی کافی منہ زور واقع ہوئی ہیں اور ان کو پکا یقین ہو گیا ہے کہ میں سگریٹ پیتا ہوں اور میرے منہ سے ضرور بو آتی ہے۔

ماچس کی بات جانے دیجئے۔ ابھی پچھلے ہفتہ میری کتابوں کی الماری درست کرنے میں کہیں سے ایک تاش کی گڈی نکل آئی۔ تب سے لاکھ صفائی پیش کرنے کے باوجود سب کی نظروں میں دیا لڑکا سمجھ لیا گیا ہوں جو ضرور جوا کھیلتا ہے۔ لطف کی بات یہ کہ مجھے تاش کے پتے تک پہچاننے نہیں آتے اور یہ گڈی میرے ایک عزیز چھوڑ گئے تھے۔ مگر میری کوئی سنے بھی۔ اگر اسی رفتار سے میری غلطیاں پکڑی اور تشہیر کی جاتی رہیں تو وہ دن دور نہیں جب یا تو میرے والدین مجھے عاق کر دیں یا پولیس کے ذریعہ میری نگرانی کرائیں۔

ایک دن تو غضب ہی ہو گیا۔ میری کتابوں کی درستی اور سامان کی خفیہ تلاشی کے سلسلے میں چھاپہ مار دستے نے ایک لڑکی کی تصویر برآمد کر لی۔ تصویر سب نے

بے حد پسند کی۔ میری پسند کو خاصہ سراہا گیا۔ بلکہ اکثر نے طے کر لیا کہ وہ در پردہ میری مدد بھی کریں گی اور شام کو وہ لڑکی بھی چائے پر کسی بہانے سے بلا بھی لی گئی۔ میں جب گھر پہونچا تو میری بہن کی سہیلیوں نے بلا کچھ مجھے بتائے یا مجھ سے کچھ پوچھے بغیر میری بہت خاطر کی۔ دوران چائے میں کبھی میری اور کبھی اس لڑکی کی جس کا ابھی مجھ سے تعارف کرایا گیا تھا کی حرکات و سکنات کی نہایت کڑی نگرانی کی گئی۔ چائے کے بعد جب میں اٹھنے لگا تو مجھے اصرار کر کے دوبارہ بٹھایا گیا۔

"آپ آخر اٹھ بیٹھے کیوں ہیں؟"

تعارف پر میں نے کہا۔

"آپ سے مل کر خوشی ہوئی"۔

اس پر ایک سہیلی نے کہا۔

"اور اس سے پہلے کیا غمی ہوئی تھی"۔

غرض نہ میری سمجھ میں کچھ آیا نہ اس لڑکی کی۔

لڑکی کو مجھے اس کے گھر پہونچانے کو کہا گیا۔ میں نے حامی بھر لی۔ مگر میری شامت دیکھئے لڑکی کو اس کے گھر پہونچا کر جو لوٹا تو ایک بے تکلف دوست مل گئے اور زبردستی مجھے سنیما لے گئے۔ سنیما سے دیر سے لوٹنے پر میری بہن کی سہیلیوں نے اچھی خاصی پریس کانفرنس کر ڈالی۔

"اب پہونچا کے لوٹے ہیں"۔

"لڑکی کیا سات سمندر پار رہتی ہے؟"

"جلدی کیا تھی، کل آتے"۔

"کیا کیا باتیں ہوئیں؟"۔

جب ہم نے ان کے ہر اشتیاق سے پُر سوال کا جواب نفی میں دیا تو ہم کو مثال کے طور پر وہ تصویر دکھائی گئی ہم نے اس پر بھی لاعلمی کا اظہار کیا تو مجبوراً ہم کو وہ کتاب دکھائی گئی جس میں سے تصویر برآمد ہوئی تھی اور صبح سے عام گفتگو اور ہنگامہ کا سبب بنی ہوئی تھی۔ تب ہماری سمجھ میں آیا کہ وہ کتاب ہمارے دوست کی تھی جس سے ہم پڑھنے کے لیے مانگ کر لائے تھے جس میں غالباً اتفاق سے یہ تصویر رہ گئی ہو گی۔ تب جاکر معاملہ رفع دفع ہوا۔ مگر بس اس قدر کہ ہماری آپا کو مشورہ دے دیا گیا کہ اب یہ بھٹکنے لگے ہیں۔ چنانچہ جلد ہی ان کے ہاتھ پیلے کر دیے جائیں۔ ہماری آپا نے اپنی سہیلیوں کی موجودگی میں ہمارے والدین سے ان کی رائے طلب کی۔ اور ہمارے والدین نے ہمارے اوپر کرفیو آرڈر لگا دیا۔

"چراغ جلنے کے بعد گھر سے باہر مت جاؤ، جو قدم اٹھاؤ سوچ سمجھ کر اٹھاؤ"۔
اور آخر میں کہہ دیا۔

"ابھی ہم مرے نہیں ہیں"۔

اب اس کے آگے ہم بھی خاموش ہو گئے اور دل میں ہم نے اپنی آپا کی سہیلیوں کو کوس ڈالا۔

فرصت کے اوقات میں ہم اکثر اپنے احباب کے گھر جاتے ہیں۔ کبھی کبھار وہ بھی ہمارے گھر آجاتے ہیں۔ ان کے جانے کے بعد ہماری بہن کی سہیلیاں ہم سے چھوٹتے ہی پوچھ بیٹھتی ہیں۔

"یہ کون لفنگا تھا؟"۔

"اس کو بات کرنے کی تمیز نہیں۔"

"اتنے زور سے ہنس کیوں رہا تھا؟"

"ایسے لوگوں کو گھر میں کیوں آنے دیتے ہو؟"

"یہ کیا کہہ رہا تھا اس نے صبح سے نہیں پی؟"

"شراب پیتا ہوگا۔"

"وہ تو اس کی آنکھیں بتا رہی تھیں۔"

"ہوا غنڈہ معلوم ہوتا ہے۔"

"ان کے دوست بھی ایسے ہی ہیں۔"

اب اگر ہم کہیں کہ سگریٹ مانگ رہا تھا تو اسمبلی میں ہماری سگریٹ نوشی پر ایک بار پھر مباحثہ چھڑ جاتا۔ چنانچہ خاموشی سے سب کچھ برداشت کرتے رہے، امتحان ہوا اور ہم ایم اے میں فرسٹ آئے اس دن ہمیں امید تھی کہ آپا کی سہیلیاں نہ صرف مبارکباد دیں گی بلکہ انعام وغیرہ بھی ملے گا۔

"فرسٹ تو کئی آئے ہوں گے۔"

"ٹاپ کیوں نہیں کیا؟"

"آخر وہ بھی تو خدا کا بندہ ہوگا جس نے ٹاپ کیا ہوگا۔"

اور ہم سمجھ گئے کہ ان سب سے پیش پانا مشکل ہے۔ اب بس یہی ایک صورت ہے کہ ہم کو دور دراز کسی دوسرے صوبے میں ملازمت مل جائے تو نجات ممکن ہے ورنہ یہاں تو اگر رونے بھی بجھوانے گئے تو الٹی نمازیں گلے پڑ جائیں گی۔ البتہ کبھی ان سے انتقام لینے کی ایک صورت نظر آتی ہے۔ وہ یہ کہ ان میں سے کسی ایک سے ہماری

شادی ہو جائے اور یہ سب کی سب ہماری سالیاں قرار پا جائیں اور پھر ہم ان سب پر رعب ماریں۔ ڈرتا ہوں یہ بات میری آپا میں نہ سن لیں ورنہ پھر کیا ہو گا؟۔

چند حسینوں کے خطوط

کتے کا خط پطرس کے نام

گدھے کا خط کرشن چندر کے نام

معمار اعظم کا خط نئی نسل کے نام

پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام

کُتّے کا خط پطرسؔ کے نام

مکرمی !

"کُتّے" پڑھنے والوں نے بلند آواز سے پڑھا اور اس خاکسار نے بغور سُنا۔ اس دل آزار مضمون سے ہماری قوم میں کافی اشتعال پھیل چکا ہے۔ گزشتہ کئی راتوں ہم اپنی "رات کی نشست" میں اس پر کافی غور و خوض کر چکے ہیں۔

آپ نے ہمیں اس قابل بھی نہیں چھوڑا کہ اب ہم چار بھلے آدمیوں کے سامنے دُم اٹھا کر چل سکیں۔ خوب! غالباً سگ نوازی اسی کا نام ہے۔ نہ ہوئے آپ ہمارے آس پاس ورنہ ضرور آپ کو کاٹ کھاتے۔ گویا ہم آپ کا دیا ہوا تب کھاتے ہیں۔ سو سُنئے نہ، اگر اس قسم کے مضامین ہم بھی باندھنا شروع کر دیں تو آپ کی کیا رہ جائے۔

مضمون میں گائے بکری سے ہمارا موازنہ کرتے وقت آپ یہ بھول گئے کہ اس خرافات پر کسی گائے کی نظر اگر بھولے سے بھی پڑ جاتی تو یہ کب کا دفتر راگا دُخورد ہو چکا ہوتا۔

بندہ پرور ہم آپ کی نظر میں بڑے سہی مگر ہماری قوم کی بہادری و وفاداری اور جفاکشی تو ضرب المثل ہے انہی خوبیوں نے ہم کو شرف الحیوانات کے مرتبہ تک پہونچایا۔ ایمان کی بات یہ ہے کہ ہماری اصلیت کو فرنگی پہچانے، ورنہ آپ حضرات نے ہمیشہ گھر کی مرغی دال برابر سمجھا اور دال کو بھی نظر انداز کر بیٹھے۔

اللہ اللہ کیسے کیسے بزرگ ہماری قوم نے پیدا کیے۔ خواجہ سگ پرست کے نام سے کون واقف نہیں وہ ہمارے ہی ایک جلیل القدر بزرگ کی پرستش فرمایا کرتے تھے۔ خواجہ صاحب کا قول تھا کہ "سامنے کا کتا دور کے بھائی سے اچھا ہوتا ہے" مگر موصوف سامنے کے بھائی کو بھی دور کے کتے کو فوقیت دیتے تھے۔ حاتم طائی کی خدمت میں ہمارے ایک بزرگ ہر وقت حاضر رہتے تھے۔ کہا جاتا ہے کہ آخر میں حاتم طائی ان کی خدمت میں حاضر رہنے لگے تھے۔ اب بزرگوں پر بات نکلی تو دور کیوں جائیے۔ اصحاب کہف کی مثال آپ کے سامنے ہے۔ ان کو ہمارے ایک بزرگ اس قدر بھلے کہ قیامت تک خود سے جدا رکھنے پر راضی نہ ہوئے، اصحاب کہف نے حضرت اسی گرائونڈ پر کہ "حق گو کتا ناشکرے آدمی پر بھاری ہوتا ہے" ہمارے بزرگ کی رفاقت پر خدا کا شکر ادا کیا۔ اور یہ واقعہ بہت مشہور ہے کہ لیلیٰ کے کتے سے مجنوں کے ذاتی تعلقات تھے۔ ان کو لیلیٰ کی جدائی گوارا تھی مگر ہمارے بزرگ کی جدائی کی تاب نہ رکھتے تھے۔ چنانچہ حضرت نے اپنی عمر عزیز کا بیشتر حصہ ان کی دُم سے چمٹ کر گزار دیا۔ جن بزرگوں سے آپ کا سابقہ سر راہے اکثر پڑا کرتا

ہے وہ ثقہ بزرگ اپنی دُم کا لنگوٹ کسے کھرے کھوٹے کی پہچان کے لیے صبح نعرۂ حق بلند کرتے رہتے ہیں اور پیٹ بھر جانے پر بھی آخرت و انجام بخیر کے امکانات پر سوچ بچار کرتے رہتے ہیں۔ جس طرح آپ جانور کب ہو چکنے کے مسئلے پر روشنی ڈالتے ہیں اسی طرح یہ حضرات ان امکانات پر غور و خوض کیا کرتے ہیں کہ ہم کتوں کے پر کیوں نہیں ہوتے ۔۔۔؟" یہ بالکل دوسرا مسئلہ ہے کہ اس موقع پر آپ ان سے گاڑی کا بیر راستے کے لیے ضد کریں اور یہ آپ کو کاٹ کھائیں۔

ہماری مقبولیت سے آپ منکر ہوں تو ہوں مگر حق بات تو یہ ہے کہ دنیا کو اس وقت ہماری سخت ضرورت ہے۔ ساری دنیا کی آنکھیں ہماری قوم پر لگی ہوئی ہیں۔ ابھی ابھی کل کی بات ہے میں نے آپ کی قوم کے ایک ممبر کو دعا کرتے پکڑا تھا۔ حضرت گڑگڑا رہے تھے۔ "چھوٹا بھائی ہونے سے کتا ہونا گوارا ہے"۔ اس وقت میں نے اندازہ کیا کہ دنیا کس تیزی سے ہمیں اپنانے کے لیے آگے بڑھ رہی ہے۔ بہت ممکن ہے کہ یہ سب کسی منظم پلان کے تحت ہو رہا ہو۔ دور کیوں جائیے، روزمرہ کی زندگی میں دیکھئے۔ آج بھی آپ میں کتنے اسی ستمگر حلقۂ دم کے اسیر ہیں جو بغیر ہمارے اپنی تصویر تو تصویر کارٹون تک نہیں کھنچوا سکتے۔ ہمارے لیے کتنے حسن کے مقابلے اور عالمی نمائشیں کی جاتی ہیں۔ سیر و شکار، جلوت و خلوت میں بلا ہمارے ہر محفل سونی و تشنہ محسوس کی جاتی ہے۔ مگر اس نسلی امتیاز کے باوجود آج بھی ہماری قوم اعلیٰ ترین خوبیوں کی حامل ہے۔ آج بلا کسی ہتھیار کے ہم ہاتھی اور شیر کو پچھاڑ دیتے ہیں۔ ہم میں کتنے شیر افگن اور شیر شاہ ہیں۔

دشمنوں کو اب ہمارے بھونکنے پر بھی اعتراض ہے۔ اطلاعاً عرض ہے کہ ہم صرف
اصولاً بھونکتے ہیں۔ آپ کے یہاں جو مثل مشہور ہے کہ بھونکتے ہوئے کتے کاٹا نہیں
کرتے۔ بجا ہی۔ لیکن کون جانتا ہے کہ ایک کاٹتا ہوا کتا کب کاٹنا بند کر دے اور
بھونکنا شروع کر دے۔ سیدھی سی بات ہے۔ مثال دے کر سمجھانے کی ضرورت نہیں۔
بھئی جس کو بھونکنا ہوگا وہ بھونکے گا اور کتنا بھونکے گا یہ اس کی قوت بھونک پر منحصر
ہے — وہ کتا ہی کیا جو بھونکے نہ — اگر کتا ہوگا تو بھونکے گا ضرور — ہم
اکثر جلسے وقت بھونکا کرتے ہیں، مگر یہ ہمارا محض اسٹائل ہوتا ہے۔ ایسے موقعوں پر اگر
ہمارے اوپر اینٹ اور پتھر نہ مارے جائیں تو ہم شاید خود بخود تھک کر خاموش بھی
ہو جائیں۔ ورنہ دوسرے حالات میں ہم جھوٹ موٹ کاٹ بھی کھاتے ہیں۔

لیکن ہماری اس بھونک کو دگر مشاعرہ گرم کرنے سے تعبیر (معاف کیجیے گا
تعبیر ہمیشہ الٹی ہوا کرتی ہے) کیا جائے تو یہ محض آپ کا خیال ہے، ورنہ اطمینان
رکھیے۔ ہم میں آپ کو شاعر ملیں گے نہ لیڈر — یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ ہمارا
کوئی فرد صاحب دیوان نہیں پایا گیا۔ ہمارے یہ اجتماع دراصل کھیل کود کے ہلکے
پھلکے ورزشی مظاہرے ہوتے ہیں۔ مگر یہ بھی ہم نے آپ ہی سے سیکھا ہے۔ ابھی حال
میں آپ کے ایک جلسے میں شرکت کرنے اس خیال سے گیا کہ دیکھیں ایسے موقعوں پر
آپ لوگ کیا کیا کرتے ہیں۔ پتہ چلا کہ ایسے موقعوں پر آپ لوگ جو دنگل کرتے ہیں۔
اس کو الکشن لڑانا کہتے ہیں۔ الکشن تو کہیں بھی نظر نہیں آیا۔ ہاں اس مار پیٹ کے ہنگامے
میں کئی بار پٹتے پٹتے بچا اور وہاں سے اپنی جان بچا کر بھاگا۔

لڑنا بری بات نہیں۔ لڑنے کو آخر ہم بھی لڑا ہی کرتے ہیں۔ مگر لڑنے کے

لیے ہم اپنے سے کمزور کو تلاش کرتے ہیں نہ لڑائی میں شرکت کرنے کے لیے لڑتے ہیں۔
اپنے حریف کو دیکھ کر ہم غرّانے لگتے ہیں۔ ایسے موقعوں پر اگر بجائے ARGUMENTS
پیش کرنے کے وہ دُم دبا کر چلا جائے یا خاموشی سے ڈائیلاگ سننے پر قناعت
کرلے تو ہم اس پر حملہ نہیں کرتے۔ لڑنے کے وقت ہم صرف لڑتے ہیں مگر نہ ہم لڑائی
ختم کرنے کے لیے لڑتے ہیں نہ سبق سکھلانے کے لیے۔ ہم کو لڑنے کے لیے آپ کی طرح
مذہب یا امن کا سہارا بھی نہیں لینا پڑتا، ہمارا سارا غصہ سوڈے کا اُبال ہوتا ہے۔
ذرا دیر کی ٹھا بھارت کے بعد ہمارا دل اور جھگڑا صاف ہو جاتا ہے۔

ہمارے یہ جلسے خالص اصلاحی قسم کے ہوا کرتے ہیں۔ مگر واضح ہو کہ ہم لوگ صرف
جلسہ کرتے ہیں چندہ کبھی نہیں کرتے۔

ہمارے راتوں کو جاگنے اور دن کو سونے کے بارے میں جو کچھ مشہور ہے۔
اس کو اسی طرح مشہور رہنے دیا جائے۔ اس کے بارے میں کوئی صفائی ہم کو پیش نہیں
کرنا ہے۔ دنیا کی تباہی اور انسانوں کی انسانوں پر عصبیت اور کم ظرفی کے باعث
ہمیں دن میں آرام سے جاگنا مشکل ہو جاتا ہے اس لیے ہم نے طے کرلیا ہے کہ جب
تک انسان انسان نہ ہو جائے ہم دن کو سویا کریں گے۔ ہم ان کی حرکتوں کو نظر انداز
کرنے کے لیے ایسا کرتے ہیں، پھر رات کو جاگ کر ہم اپنے کو قدرے آرام میں محسوس
کرتے ہیں، اس وقت ہمارا محبوب مشغلہ تاریک راتوں میں چھپ چھپ کر حرکتیں کرنے
والے بزدل انسانوں کی دیکھ بھال کرنا ہوتا ہے، ایسے میں رات گئے اگر کسی کو
آوارہ گردی کرتے دیکھ پائیں تو بطور احتجاج ٹوک بھی دیتے ہیں۔

ہماری قوم کی نظر میں کچھ بھی سہی، مگر یہ حقیقت ہے کہ ہمارا کوئی ہم جنس

کبھی رشوت لیتا یا دیتا ہوا نہیں پکڑا گیا۔ رہی مکان جائیداد کی طرف سے ہماری بے نیازی۔ اس کا سبب آپ حضرات کا وہ مشق ستم ہے جو ان مٹی کے گھروندوں کے لیے ایک دوسرے پر فرمایا کرتے ہیں۔ ہم نے کبھی کلی کوئی مذہب یا روزگار اسی سبب نہیں اختیار کیا کہ اس میں ہمیں بوئے فساد آتی ہے، اور وہ تو کہئے ہم نے مصلحتاً سائنس کی تعلیم پر زور نہیں دیا۔ ورنہ آج بلا تکلف ایٹم بم کی ایجاد ہمارے سر تھوپی جا چکی ہوتی۔

عورتوں کے حقوق آپ ہم سے مستعار لے سکتے ہیں۔ اس بیسویں صدی میں بھی ہمارے یہاں اس قدر مساوات ہے کہ اگر ہم ایک دفعہ اپنی بیگم صاحبہ پر بھپتی کسنے کا ارادہ بھی کریں تو وہ ہم کو اس درمیان میں تین چار مرتبہ کاٹ بھی کھائیں یا اس وقت تک لگاتار بھونکتی رہیں جب تک کہ ہم اپنا ارادہ POST-PONE نہ کر دیں۔

ہمارے یہاں ہر چیز کا ایک نام ہوتا ہے اس کے آگے ہم لفظ 'اصلی' کا اضافہ اس وجہ سے نہیں کرتے کہ وہ لفظ بذات خود اصلیت ہوتا ہے۔ اگر آپ ہمارے یہاں جھوٹ، تصنع، بدکرداری، بلیک مارکیٹ کے قسم کی چیز کھانے کے خیال سے بھی ڈھونڈیں۔ تو آپ کو سخت مایوسی ہوگی۔

ہماری قوم سیاست اور لیڈر دونوں کو شک کی نگاہ سے دیکھتی ہے، اور دور دور رہتی ہے۔ ہم نے آپ کی نام نہاد تعلیم پر اپنی جہالت کو ترجیح دی مگر ترجیح داری سے ہمیشہ دور بھاگے۔ دولت اور غربت کے مسئلہ پر اپنی حیثیت خاموش تماشائی کی جانی ——— اب آپ ہی انصاف کیجئے کہ جس قوم کے پاس لاٹھی اور بھینس دونوں ہی مفقود ہوں ۔ جو قوم شاطر لیڈر اور سیاست دانوں سے یکسر

خالی ہو آپ اس کو خراب کہاں سے کہہ سکتے ہیں۔ جن کے آدرش اتنے بلند ہوں کہ وہ زندہ رہو اور زندہ رہنے دو، کے لیے دن رات بھونکتی رہتی ہو۔ اس کو آپ انسانوں پر کیوں فوقیت نہیں دے سکتے۔

میرے خیال میں خط بہت طویل ہوا جاتا ہے۔ مگر اس کو ختم کرنے سے قبل آپ کی توجہ ایک بات کی طرف دلا دوں۔ بات تو خواب و خیال کی ہے۔ کہ خواب میں آپ کو کتے ہی کتے نظر آتے ہیں۔ اگر ہم میں سے کسی کو جاگتے میں انسان نظر آجائیں تو اس کو پاگل تصور کیا جاتا ہے۔ اور حتی الامکان بچنے کی کوشش کی جاتی ہے۔

امید ہے کہ آپ تھوڑے کو بہت اور خط کو تار سمجھیں گے اور دوسروں کے دامن کو تار تار کرنے کی آئندہ کوشش نہ کریں گے ـــــ معلوم نہیں کہ آپ میرے خیال سے متفق ہوں یا نہیں، لیکن اتنا ضرور چاہوں گا کہ دوران خط و کتابت اگر آپ اختلاف بھی کریں تو علمی انداز سے۔ اس سے مجھے فائدہ ہو گا۔ فقط

آپ کا مخلص

"ایک کتا"

گدھے کا خط کرشن چندر کے نام

رامو واشنگ کمپنی۔ ڈنکی لائنز (کرسی)، بارہ بنکی۔

یکم اپریل سن ستاون عیسوی

حوالہ نمبر۔ س۔ الف۔ ۲۱/۴۹۳/۳

کرشن جی ــــــ ڈھینچوں ڈھینچوں ــــ!

شاید مجھ گدھے کو پہچاننے میں آپ کو دقت نہ ہو۔ اطلاعاً عرض ہے کہ میں وہی مشہور و معروف بولنے والا گدھا ہوں جس کی بائیوگرافی یا آٹو بائیوگرافی آپ نے تصنیف فرمائی ہے۔

کیا عرض کروں جب میرے بزنس پارٹنر پرجوٹیا محل والے سیٹھ پرجوٹیا

یعنی سیٹھ من سکھ لال جی، ان کے ظالم ملازم اور بے وفا حسینہ روپ وتی (جو میری بیوی ہوتے ہوتے رہ گئی) وغیرہ نے متحدہ محاذ بنا کر اچانک ایک شام مجھ پر حملہ کر دیا۔ اور وہ بھی اس معمولی سے انکشاف پر کہ میرے پاس وہ پچیس کروڑ والا (ایس ریفائنری) کا ٹھیکہ نہیں ہے بلکہ محض اس کے بارے میں میری پنڈت جی سے بات چیت ہوئی تھی، خدا پریس والوں کو اس کا اجر خیر اور سنسنی خیز خبریں دے کہ وہ مجھے عالم بے ہوشی میں لا کر جانوروں کے ہسپتال میں داخل کر گئے، یہاں انیمل سرجن نے فوراً مجھے ایک قسم کی گھاس سنگھائی تب جا کر مجھے ہوش آیا۔ میرا بیان نزاعی لے کر پریس میں ریلیز کر دیا گیا، ڈاکٹر نے دوا علاج کے ساتھ مجھے مکمل آرام کرنے کا مشورہ دیا۔

ہسپتال میں اکثر مطالعے کے لیے "شمع" حاصل کر لیتا اور جگالی کے علاوہ فرصت کے اوقات میں گھاس کے تنکے توڑنے کے ساتھ ساتھ اپنی سوانح بھی پڑھا کرتا جو ان دنوں اس میں قسط وار شائع ہو رہی تھی، اکثر موڈ میں آ کر اس کو زور سے پڑھتا یہاں ڈاکٹر اور جانور لوگ اسے بڑے شوق سے سنتے، سامعین پر اس بات کا خاصا رعب پڑتا کہ ان کے درمیان کوئی معمولی گدھا نہیں ہے۔ مگر دور سے دیکھنے اور سننے والے یہی سمجھتے کہ میں اپنے کارناموں کی راگ مالا نہیں بلکہ ڈھما الاپ رہا ہوں۔

یہاں سے ڈسچارج ہونے کے بعد میں اپنے وطن کرسی ضلع بارہ بنکی چلا آیا آتا آپ بھی جانتے ہوں گے کہ کرسی شریف کے بیوقوف اور گدھے دنیا بھر میں مشہور ہیں احمقان کرسی جو مجھ ناچیز گدھے سے ملاقات کے مشتاق تھے، اخبار میں میری سرگرمیاں اور کارنامے پڑھتے پڑھتے ان کے کان پک چکے تھے۔ چنانچہ انھوں نے میرا شاندار استقبال کیا، یہاں کے سیاسی لیڈروں نے مجھ سے ایک پبلک اسکول کا سنگ بنیاد رکھوایا اور

جانوروں کی نمائش کا افتتاح کروایا۔ یہاں کے ایک مشہور سیاسی لیڈر اور قانون داں نے میری دکھ بھری کہانی سننے کے بعد اپنی قانونی خدمات مفت پیش کر دیں۔ یہ حضرت یہاں ٹاؤن ہال کے چیرمین بھی رہ چکے ہیں اور اس امید پر کہ الکشن کے موقع پر کمہار، کمہار دھوبی، موچی، گھسیارے، کبڑیے اور گدھے والوں کے ووٹ کے لیے میں ان کے حق میں ایک تقریر کر دوں۔ اس کے عوض وہ مجھ گدھے کو اپنا باپ تک بنانے پر تیار ہو گئے۔ خطرہ یہ تھا کہ یہ حضرت بھی اپنی دامادی میں لے لیتے۔ مگر میں نے صاف انکار کر دیا۔ "تقریریں جتنی چاہو کروا لو۔ مگر کہیں ایسا غضب نہ کرنا ورنہ سیٹھ کی طرح تم پر سے بھی اعتماد اٹھ جائے گا۔ دوسرے یہ کہ میں یہاں سے گھر جانا چاہتا ہوں نہ کہ دوبارہ ہسپتال۔

انھوں نے اس کو بخوشی منظور کر لیا۔ ان کے مشورے سے میں نے رامو دھوبی کی بیوی اور بچوں کو اپنے پاس بلوا لیا۔ یہ لوگ اب تک بریجوبیا محل کے کپڑے دھوتے تھے پھر رامو کی بیوی کی معرفت سیٹھ من سکھ لال کو ایک قانونی نوٹس دیا گیا جس میں مجھ ناچیز گدھے کو حبس بے جا میں رکھنے جسمانی اذیت پہونچانے کے الزام میں قانونی چارہ جوئی کرنے کی دھمکی دی گئی، مصالحت کی صورت میں مجھے فوراً ہرجانہ ادا کرنے کا مشورہ دیا گیا۔ اس کے علاوہ میری شہرت عام کو جو اس حادثہ سے دھکا پہونچا اس کے لیے ہتک عزت کے دعوے کی دھمکی بھی دی گئی، ساتھ ہی اس نوٹس کی ایک نقل پریس میں اشاعت کے لیے دے دی گئی۔ پریس فوراً حرکت میں آ گیا۔ سیٹھ نے معاملے کو دبانے کی خاطر پریس اور قانون کے خوف سے اپنے وکیل کی معرفت مجھے پچاس ہزار کا ایک چیک بھجوا کر راضی نامہ لکھوا لیا۔ اس درمیان میں اپنے پرانے مالک دھبو کمہار کے یہاں آ گیا تھا

دھبو نے اپنے پرانے دھبرو کو آنکھوں پر خوش آمدید کہا۔ رہنے کے لیے تھان اور ہری ہری دوب پیش کی تو مجھ گدھے کے کان یہ سوچ کر شرم سے جھک گئے کہ جب دھبو میری شہرت کی بو پا کر میرے بوڑھے ماں باپ کے ساتھ مجھ سے ملاقات کرنے پر جوبٹیا محل آیا تھا تب میں نے غرور میں آ کر اپنے آپ کو اس کی ملکیت اور دیسی گدھوں کی اولاد ہونے سے انکار کر دیا تھا اور وہ بھی محض اس نتیجے پر کہ میرا تعلق ان اذلیل ترین اور مکروہ نسل گدھوں سے نہیں، بلکہ جو گدھوں کے باوا آدم کے زمانے سے خالص نسل سے چلے آرہے ہیں۔ اور جن کی ذات کے خالص گدھے آج بھی آغا خان، لارڈ ماؤنٹ بیٹن اور ونسٹن چرچل کے اصطبل میں باندھے جاتے ہیں۔ اس کے علاوہ ہالی ووڈ، بمبئی، دنیا کے بڑے بڑے سرکسوں اور کارنیوال میں موجود ہیں گو کہ اس میں شک نہیں کہ کرسی کے احمقوں کے درمیان ہماری نسل کے شریف اور نجیب الطرفین ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے، البتہ مجھے یہ دامادی والی رسم پسند نہیں یوں تو معاف کیجئے گا آج بھی آپ کے یہاں دامادی کے لیے دیدہ و دانستہ گدھے ہی تلاش کیے جاتے ہیں جو اپنے گدھے پن کی وجہ سے بڑے بڑے عہدے حاصل کرتے ہیں، مگر آپ سے بھی کیا چوری اگر ہمارے یہاں گدھے میں کچھ انسانیت کے آثار بھی پائے جاتے ہیں تو دامادی تو بڑی بات ہے اس کا ہمارے تھان پر گزارا بھی مشکل ہو جائے۔ دو تنکے گھاس دینا تو دور کی بات ہے نہ جانے کیوں آپ کے یہاں مطلب کے وقت ہم گدھوں کو داماد اور شوہر اور باپ تک بنا لیا جاتا ہے، ہم گدھوں سے یہاں اس کا کوئی رواج نہیں۔ یہ بتلایئے آپ کے یہاں ہم گدھوں سے عشق کرنے کا رجحان کیوں اتنا زیادہ ہے۔ اس سے گدھے بہت سخت پیدا ہوتے ہیں، کیونکہ پھر وہ گھر کے رہتے ہیں نہ گھاٹ کے۔ گدھوں کی نسل پر اس کے جو اثرات پڑ رہے ہیں ان کو کوئی بے وقوف سے

بے وقوف گدھا بھی اچھا نہیں کہہ سکتا۔

یہ تو کرشن جی آپ خود بھی ذاتی طور پر جانتے ہوں گے کہ کرسی کس قدر پر فضا مقام ہے۔ یہاں کی بہار کا عالم یہ ہے کہ خزاں تک کے موسم میں ہر چیز پر گھاس کا دھوکا ہوتا ہے۔ برسات کی ہری ہری دوب کا کیا کہنا۔ میں نے اس رقم سے جو مجھے اپنی ہڈیاں تڑوانے کے عوض ملی تھی ایک خوشنما قطعۂ گھاس خرید لیا ہے اور دہی سے رامو دھوبی کی بیوی کو ایک شاندار لانڈری کھلوا دی ہے وہ اب زندگی کے دن بڑے آرام سے گزار رہی ہے۔ مالکن کو اب برجوتیا محل کے گندے اور ناپاک کپڑے نہیں دھونا پڑتے جن کا مقصد ستر پوشی نہیں بلکہ جسموں کی بیہودہ نمائش تھا۔ اس کے بچے اب اسکول میں پڑھتے ہیں۔ میری دعا ہے کہ وہ لکھ پڑھ کر قابل نکلیں بڑے بڑے دھوبیوں اور ذات برادری میں نام کر جائیں۔

میں دن رات گھاس چرتا اور مطالعہ کرتا رہتا ہوں۔ میرے ماں باپ میرے ساتھ ہی رہتے ہیں اور اس فکر میں ہیں کہ جلد ہی کسی سیدھی سادھی گدھی کی لگام میرے گلے میں ڈال دیں، سعادت مندی کا بھی یہی تقاضا ہے کہ میں اپنے بوڑھے ماں باپ کا دل رکھ لوں، امید ہے کہ اس موقع پر آپ ہمارے پرار کے شریک ہوں گے۔

چند روز ہوئے مجھے آپ کے پبلشر کی جانب سے ایک خوبصورت پیکٹ موصول ہوا۔ اس میں میری سوانح حیات نہایت دیدہ زیب خوشنما اور با تصویر فوٹو آفسٹ پر چھپی ہوئی کتابی شکل میں تھی، میری جانب سے اس خرنوازی پر ان کا شکریہ ادا کر دیجئے گا۔ اس میں شبہ نہیں کرشن جی اتنے بڑے اور پہنچے ہوئے ادیب ہوتے ہوئے بھی آپ نے مجھ گدھے کا جس قدر گہرا مطالعہ کیا ہے اس سے پتہ چلتا ہے کہ آپ ہم گدھوں اور ہماری نفسیات

سے کتنا قریب ہیں، اتنا شاید ہم گدھے بھی اپنے آپ سے واقف نہیں ہیں۔ ایک گدھے کی خاطر اس تخلیق پر میری طرف سے بلا کسی تکلف کے مبارکباد قبول فرمائیے۔ دل تو چاہتا ہے کہ آپ کو گلے لگا کر اپنی پیٹھ پر سوار کر لوں مگر افسوس کہ اس وقت آپ مجھ سے بہت دور ہیں۔

اول اول جب میں نے اپنی عمر گزشتہ دیکھی تو مجھے شبہ ہوا کہ غالباً میری پرائیوٹ لائف کا پبلک اکسٹنٹ بنایا گیا ہے۔ مگر اس کو پڑھتے ہی یہ شبہ دور ہو گیا نہ جانے میں اس کو کتنی بار پڑھ اور دوسرے گدھوں کو سنا چکا ہوں۔ اکثر تو اس کے مطالعہ میں ایسا غرق ہوا کہ بسا اوقات گھاس چرنا اور ہنہنانا بھول گیا۔ سچ پوچھئے تو میرے پاس شکریہ ادا کرنے کے لیے موزوں الفاظ نہیں، آپ نے مجھ ناچیز گدھے کو ایک عقلمند گدھا لکھ کر خواہ مخواہ میں شرمندہ کیا اور کانٹوں میں گھسیٹا۔ ورنہ میں تو ایک معمولی بولنے والا گدھا ہوں۔ آپ کا سابقہ تو بڑے بڑے بولنے گدھوں سے پڑا ہوگا، میں اس کو پڑھ کر اتنا خوش ہوا کہ دیر تک میری فخر سے دُم اٹھی رہی کہ آج ایک گدھا بھی عقلمند ثابت کیا جا سکتا ہے، بقول پنڈت نہرو کے "انسان کی سائنس کیا نہیں کر سکتی"۔ اس کتاب کے پڑھنے سے بہتوں کا بھلا ہوگا یا نہیں مگر میرا بھلا ضرور ہو گیا۔ جب سے میں نے اس کتاب کو پڑھا ہے میرا وزن بیس پونڈ بڑھ گیا۔ اور تو اور میں اپنے دکھ درد بھول کر اپنے کو ایک مہاتما گدھا محسوس کرنے لگا۔ جب میں نے اس کتاب کو اتنا پسند کیا تو پھر عام گدھا (کیونکہ عام گدھوں سے میرا انٹلکچوئل لیول نسبتاً زیادہ ہے) اسے کتنا پسند کرے گا۔ دراصل اس کے لکھنے کے بعد آپ صحیح معنوں میں گدھوں میں بے حد ہر دل عزیز ہو گئے۔ آپ کی اس معرکۃ الآرا تصنیف نے گدھوں کی دنیا میں ہلچل مچا دی۔ اس

سلسلے میں میری اور گدھوں سے بھی بات چیت ہوئی ہے گدھوں میں آپ کی بڑھتی ہوئی مقبولیت
کو دیکھتے ہوئے مجھ گدھے کا آپ کو دوستانہ مشورہ ہے کہ آپ مناسب سمجھیں تو ابکی کرسی شریف
سے الکشن کے لیے کھڑے ہو جائیے، سب گدھے اور گدھے والے نہ صرف آپ کو ووٹ
دیں گے بلکہ آپ کا الکشن بھی لڑائیں گے اور کیا عجب ہے کہ آپ اسی بہانے ممبر پارلیمنٹ
یا وزیر ہو جائیں۔ ویسے بھی ہم گدھوں کے مسائل پیش کرنے کے لیے ہم کو ایک نمائندے
کی ضرورت ہے۔ یہاں کے حالیہ الکشن کے سلسلے میں مجھ گدھے پر بے حد زور ڈالا گیا ہو
کہ میں بھی کھڑا ہو جاؤں، مگر میں نے انکساری سے کام لیتے ہوئے ان کی پیش کش کو
شکریے کے ساتھ نامنظور کر دیا کہ بھلا میں گدھا کس لائق ہوں، آپ کو اس کام کے
لیے مجھ سے بہتر گدھے آسانی سے مل جائیں گے۔ مگر الکشن میں کھڑے ہونے کا مشورہ دینے
والے عموماً وہی حضرات تھے جو ڈرتے تھے کہ کہیں میں ان کی جگہ یا ان کے مقابلہ پر نہ کھڑا ہو جاؤں۔
مگر اب سکون کی زندگی گزارنا چاہتا ہوں۔ آپ تو جانتے ہی ہیں کہ ہم گدھوں کی زندگی
میں سکون کہاں اور کم از کم میرے لیے، ملاقاتیوں کی بھیڑ بھاڑ، کالج کے لڑکوں اور
لڑکیوں کی آٹوگراف کے لیے یلغار جو کہ حسب معمول ہر گدھے کی آمد پر ہوتی ہے۔ میرے ساتھ
گروپ کھنچانے والوں کا رش، ان سب سے پریشان ہو کر میں نے ملاقات کے اوقات مقرر
کر دیے ہیں، مگر افسوس کہ اس پر اتنا ہی عمل نہیں ہو پاتا جتنا لڑکے اپنے اسکول یا پڑھنے کے
ٹائم ٹیبل پر کر لیتے ہیں۔

کرشن جی! کیا عرض کروں۔ میری جو ہر طرف اتنی تعریفیں ہوئیں، رہنے کو محل
ملا، وزیر اعظم نہرو نے ملاقات کی، پریس کانفرنس کو خطاب اور میونسپلٹی کو ایڈریس کرنے
کے علاوہ حسن کے مقابلہ کا جج چنا گیا۔ مجھ گمنام گدھے کی جو اتنی آؤ بھگت ہوئی تو لاکھ

گدھا ہونے کے باوجود میں اپنے آپ کو کچھ سمجھنے لگا اور مجھے دور دور کی سوجھنے لگی۔ اس کو شاید آپ میری گدھا پنتی تصور کریں۔ میرے پڑھنے لکھنے کی واہ واہ ہوئی تو مجھے بھی لکھنے لکھانے کا شوق چرایا۔ سب سے پہلے میں نے قصیدہ "در مدح خرِ عیسیٰ" رسالہ بوجھ بجھکڑ کو بھیجا جو اس قدر پسند کیا گیا کہ تقریباً ہر رسالے نے پبلک کو اس کا مفت حافظہ کروایا۔ اس کے بعد جو ایڈیٹروں اور پبلشروں کے خطوط اور تار آنا شروع ہوئے "کچھ ہمیں بھی بھیجے" تو میں نے خوب ہی خوب لکھا، غزلیں، نظمیں، افسانے، ناول، TRASH فلمی اسٹوریاں جن پر نہ صرف پبلک نے مجھے خراج تحسین پیش کیا بلکہ کرسی بھر میں میرے ڈرامے اسٹیج اور نشر کیے گئے۔ میں نے گدھوں کے تقریباً ہر پرابلم کو اٹھایا، یہاں تک کہ انھوں نے مجھے اپنی انجمن کا صدر بنا دیا اور میں ایک سوشل گدھا ہو گیا۔ لکھنے پڑھنے سے میری طبیعت گھبرائی تو میں گھاس چرنے اور ادب کی گھاس کاٹنے یہاں چلا گیا جہاں لڑکیاں آٹوگراف حاصل کرنے کے بہانے مجھے گھیرے رہتیں اور میں انھیں خوب خوب فلرٹ کرتا۔ اس ماحول نے مجھے بہت جلد نشے باز بھی بنا دیا۔ غرض میں نے گدھوں سے دور رہ کر گدھوں کی وہ درگت بنائی کہ توبہ بھلی۔ کسی کو بھی نہیں بخشا، مگر میری سیلانی طبیعت جلد اس طرف سے اچاٹ ہو گئی کیونکہ گدھا زیادہ دیر تک اپنے بھائی سے دور نہیں رہ سکتا۔ تھان پر رہ کر سوچنے کے بے شمار مواقع ہوتے ہیں غور و فکر کے بعد میں اس نتیجے پر پہونچا کہ میں رہا گدھے کا گدھا۔ اور اب تک جو میں نے گھاس کاٹی ہے اس خرنگاری کا ادب سے باوجود نقادوں کی تحسین و آفرین کے دور کا بھی تعلق نہیں۔ اس لیے میں نے دوسرے گدھوں سے اپنے کو ممتاز رکھنے کے لیے اپنے آپ کو اس گورکھ دھندے سے نکال لیا۔

اب اس پرفضا جگہ کا سکون، ہری ہری دوب، ڈھینچوں کی تانیں اور چھوا چھو کی آوازیں

گھر اور گھاٹ کی جنت میں دوبارہ آ گیا ہوں۔

مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ انسانوں کے سامنے آپ نے اس حقیقت کو پیش کر کے بڑا کام کیا اور ہم گدھوں پر بڑا احسان کیا کہ ہم گدھے نسلاً بعد نسلاً ہم گدھے ہی رہتے ہیں، بھوت حیات سے ہماری نسلیں محروم ہیں۔ گدھوں کے باوا آدم سے لے کر اگر اب تک ہم کچھ ہیں تو صرف گدھے ہیں، ہم گھاس کھانے، ڈھینچوں ڈھینچوں کی تانیں اڑانیں اور دولتیاں جھاڑنے سے زیادہ کچھ بھی نہیں جانتے، ہماری زندگی بقول آپ کے ایک کھونٹے سے دوسرے کھونٹے تک گھر سے گھاٹ اور گھاٹ سے گھر تک محدود ہیں۔ موجودہ سائنس، تہذیب، تمدن، اور طبقہ داری سے ہم گدھے عموماً ناآشنا ہیں۔ نہ امن کا نعرہ بلند کرنے کے لیے ہم بم ایجاد کرتے ہیں اور نہ امن قائم رکھنے کے لیے ہم جنگ کرتے ہیں۔ ہم گدھوں کا تشدد اور عدم تشدد ہماری دولتیوں تک محدود ہے۔ کبھی کبھار اگر مضائقہ نہ ہوا، گھاٹ کو دیر ہوتی ہو اور مالک کا اشارہ مل جاتا تو ہم گدھے اپنی سرپٹ چال سے گھوڑوں تک کو شرمندہ کر دیتے ہیں۔

آپ نے انسانوں کو موقع دیا کہ وہ ہم گدھوں کے وجود اور ان کی اہمیت کو محسوس کر رہا ہے۔ اس خیر سگالی کے جذبے کو پیدا کرنے میں آپ کی حیثیت گدھوں میں نہایت اہم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج دنیا گدھوں کے لیے اور گدھوں کی طرح سوچنے سمجھنے پر مجبور ہوتی جا رہی ہے۔ بھلا انسانوں کو گدھوں کے قریب سے قریب تر لانے میں آپ سے بڑھ کر کس کا ہاتھ ہو سکتا ہے۔

کرشن جی! فرصت کے اوقات میں میں نے نئی نسل کے گدھوں کے لیے ایک ماسٹر پلان تیار کیا ہے۔ اس کی ایک نقل عنقریب آپ کو بھجوانے والا ہوں اس سے آپ کو

یہاں کی نئی پود بہت کچھ سیکھ سکتی ہے۔ جیسا کہ پنڈت جی نے فرمایا تھا "ایک گدھے سے بھی بہت کچھ سیکھا جا سکتا ہے" اور آپ کی یہ بات میرے دل کو لگ گئی تھی۔ میں نے طے کر لیا تھا کہ کچھ نہ کچھ ہی نہیں بلکہ ہم گدھے بہت کچھ سکھا سکتے ہیں۔ آپ کو یہ نہ بھولنا چاہیے کہ ہم سے آپ گدھوں کے مسائل بہت ملتے جلتے ہیں۔ مثلاً روٹی کے مقابلہ میں آپ گھاس رکھ سکتے ہیں، تھان کے مقابلہ پر مکان اور بڑھتی ہوئی بے روزگاری۔ مگر ٹھہریئے میں بھول رہا ہوں۔ آپ کے یہاں گدھا ہمیشہ با روزگار اور ہمارے یہاں سدا بے روزگار رہتا ہے۔ بہر حال یہ ایسی باتیں ہیں جن پر ہم آپ کبھی بھی کان جوڑ کر بیٹھ سکتے اور غور کر سکتے ہیں۔

کرشن جی آپ نے اس مشہور و معروف "سرگزشت" میں جس کو میں "خر گزشت" کے نام سے یاد کرتا ہوں، مجھ گدھے پر خاصی روشنی ڈالی ہے۔ اور یہاں تک بتا دیا کہ ہم گدھوں میں ہندو مسلمان تک کا مسئلہ نہیں پیدا ہوتا، مگر پھر بھی یہ کتنی خراب بات ہے کہ گدھے ہندو اور مسلمان بنائے جاتے ہیں خواہ ان میں لاتعداد گدھے مل جائیں یعنی ایک سے ایک بڑھ کر گدھے۔ خیر چھوڑیئے ان جھگڑوں کو۔

آپ بتائیے آج کل کس جانور پر لکھ رہے ہیں۔ ہم گدھوں پر بھی نظر رکھیے گا۔

اچھا اب رخصت — اجازت ہے؟

جواب کا منتظر ——— آپ کا بھائی۔ گدھا

(مسٹر ڈنکی آف بارہ بنکی)

معمارِ اعظمؒ کا خط نئی نسل کے نام

نورِ چشمی نئی پود!

میں سوچ رہا تھا کہ تم کو خط نہ لکھوں، مگر لکھ رہا ہوں، آج کل کرتا کچھ ہوں اور لکھتا کچھ ہوں۔ مگر سوچتا بالکل نہیں، نہیں نہیں، میں غلط کہہ رہا ہوں مجھے یہ نہیں کہنا چاہیے تھا۔ میں بالکل وہی کرتا ہوں جو سوچتا ہوں، مگر میں کچھ بھی کروں تم سے مطلب؟ آخر تم لوگ کون ہوتے ہو میرا انٹرویو لینے والے۔

ارے لڑکو! تم کو آخر کیا سوجھی کہ "خطائے بزرگاں گرفتن خطاست" کو بھول کر ہماری آبرو ریزی پہ آمادہ ہو گئے۔ سنا ہے خدانخواستہ دشمن کے کان بہرے اب تم

ؒ سے مراد دی، آدی پیپرز P.S ۷۰۱

ہمارے اوپر تنقید کرنے اور ہماری قدر و قیمت کا تعین کرنے کی سوچ رہے ہو۔ کیا تم نہیں جانتے کہ باادب با نصیب اور بے ادب بے نصیب ہوتا ہے۔ میاں ابھی تمھارے کھانے کھیلنے کے دن ہیں یہ سوچ بچار کے چکر میں کہاں پڑ گئے۔ ہم سے اور حساب کتاب بقول شاعر۔ ع خیر چھوڑو۔ شاعر نے شاید اس موقع کے لیے کچھ کہا ہی نہیں۔

جب ہم تمھاری عمروں کے تھے تو کبھی بھول کر بھی غور و فکر کے پاس نہ پھٹکتے تھے (اور تم ہم کو پھٹکی میں لانا چاہتے ہو) نہ ہم نے کبھی انجام و عاقبت کی خبر لی۔ ہم نے تو بس فارموں کے سانچے گڑھ لیے تھے ان ہی میں جب ضرورت پڑتی ادب ڈھال لیتے تھے۔ جب ہم نے اپنے ادب اور تحریک پر کبھی تنقید نہیں کی، تو آخر تم لڑکوں کو اس کا کہاں سے حق پہونچتا ہے۔ بھئی خدا را مصلحت سے کام لو، آخر ہم نے بھی ہمیشہ مصلحت ہی سے کام لیے تھے اور کتنے پھلے پھولے۔ مگر تم سب عجب ناعاقبت اندیش ہو۔ نہ پارٹی بناتے ہو، نہ کسی کو اٹھاتے ہو نہ سنبھلتے ہو، نہ ڈگراتے ہو۔ آخر کیسے ادیب ہو، آخر کچھ اسمارٹ ہو۔ بھئی ہماری سمجھ میں سوائے اس کے کچھ نہیں آتا کہ تم لوگ پڑھ پڑھ کر اپنے آپ کو خراب کیے لے رہے ہو۔ بہتر تو یہ ہوتا کہ اب تک ہم جو کرتے اور کہتے آئے ہیں وہی تم بھی کرو، اگر کچھ نہ ہوا تب بھی اس جھنگی میں، اور نہ سہی تو تمھاری تاریخی اہمیت تو ہو ہی جائے گی۔ مگر خدا را اپنے آپ کو غور و فکر کے دھندے میں نہ پھنساؤ، ابھی تو تمھارے کیریر بنانے، منصب حاصل کرنے، خوشامد کرنے (کیونکہ خوشامد ہی سے آمد ہوتی ہے ورنہ آورد کا شکار رہنا پڑتا ہے) اور سیاست اڑانے کے دن ہیں۔ اگر ابھی سے تم نے ہم دی، آئی، پیز کو خفا کر دیا تو اور تو اور شاید ہم تم کو ادب سے بھی عاق کر دیں، ورنہ بھلائی اسی میں ہے کہ جیسے ابھی تک ہماری جلیبیں بھرتے

آئے ہو۔ اسی طرح ہونہاری، سعادت مندی اور دوراندیشی سے جی حضوری کیے جاؤ۔ ورنہ سمجھ لو ابھی وقت ہے۔ اگر ہم نے تمہارے خلاف فیصلہ دے دیا تو بعد میں تمہیں کوئی گھاس بھی نہ ڈالے گا۔ اور تمہارا سارا کیریر دھرے کا دھرا رہ جائے گا۔

ورنہ میری مانو تو نظمیں، غزلیں، افسانے، ڈرامے مینے یا اپنے دوستوں کے انتخاب کر ڈالو۔ دیباچے اور حاشیے ہم لکھ دیں گے۔ اگر کوئی تخلیق یا مجموعہ چھپوانا ہو تو ہمارے پاس آؤ۔ مگر اس طرح اکڑ کے نہیں بلکہ جیسے ہم چاہیں ویسے، تعارف تمھیں گے۔ اڈیٹر یا پبلشر کو تعارفی خطوط لکھ دیں گے۔ مگر ساتھ ہی یہ نہ بھولنا کہ تالی دونوں ہاتھوں سے بجتی ہے۔

یہ نہ بھولو کہ ہم نے ہمیشہ حکومت کی ہے۔ ہماری نظر بڑی وسیع تھی۔ اسی لیے ہم نے محلوں میں رہ کر بھی جھونپڑوں کے خواب دیکھ لیے تھے۔ ہم نے پلاؤ کھا کر بھی بھوک کی لذت کو محسوس کر لیا تھا، ہم نے غیر جانبدار رہ کر بھی اپنوں کو منوا لیا تھا۔ حکومت کرنا ہمارا پیدائشی حق ہے۔ کوئی ہم کو ہمارے اس حق سے محروم نہیں کر سکتا۔ مانا کہ اب ہماری مصروفیات کچھ اور ہیں۔ مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔ بھئی یہ دنیا اب کچھ عجیب سی ایکسٹرنی ہو گئی ہے۔ نہ جانے اب اس کی پسند اور ناپسند کا معیار کیا رہ گیا ہے۔ ہر وقت خواہ مخواہ عمل عمل چلاتی ہے۔ عمل سے ہم نے کب انکار کیا تھا۔ اس کی اہمیت سے ہم ہمیشہ دوسروں کو آگاہ کرتے رہے۔ مگر سنا ہے تم لوگ عمل سے مراد اب "عملاً" سے لینے لگے ہو۔ بھئی کیا احمق ہو۔ بھلا، آج کل کیا ہو سکتا ہے۔ یہ تو جمود کا زمانہ ہے۔ آخر لکھیں بھی تو کیا؟ سب کچھ تو کہا جا چکا ہے اب اسی کو چاہیے تم دوہرا دو یا ہم۔ مگر اس لوٹا پھیری سے فائدہ؟ سچ تو یہ ہے کہ اب سوائے تقریر کرنے اور جج بننے یا صدارت

کرنے کے کسی چیز میں لطف بھی نہیں آتا۔ مصروفیات مہلت ہی نہیں دیتیں، کبھی ادبی دورے کبھی ادبی معرکے، کبھی خیرسگالی وفد میں ادب کی نمائندگی کرنے کے لیے کالے کوسوں چلے جا رہے ہیں۔ غرض ایک مصیبت رہتی ہے اور سے انعام کے طور پر ناکردہ گناہوں کے الزام تم ہمارے سر تھوپتے ہو۔ مانا کہ ان غلطیوں کی عمر تمہاری عمروں سے کہیں زیادہ ہے، مگر پھر بھی قصور تمہارا ہے، ہم بالکل معصوم ہیں۔ تمھیں حق نہیں کہ ہمارے اوپر الزام لگاؤ۔

اپنے زمانے میں اور اب بھی ہمارے یہاں ایک وضعداری اور شرافت ہے۔ ہم جس سے بھی خوش ہوئے جس نے ہم کو آرام پہونچایا اور ہماری ذرا بھی خدمت کی ہم نے اس کو اونچا کیا اور اتنا اونچا کیا کہ بانس پر چڑھا دیا، کیوں نہ کریں جو ہماری خدمت کرے گا وہ عظمت پائے گا۔

تم لوگوں کو سوائے رونے دھونے اور قلم گھسنے کے اور بھی آتا ہے۔ تم میں نہ کل ہے نہ بل نہ چھل، رسالہ نکالنے کا گر تم نہیں جانتے۔ اڈیٹر، اور پبلشر کو قابو میں تم نہ لاسکو، قاری کو تم مرعوب نہ کر سکو۔ وہ تو ہم ہی تھے کہ اڈیٹر کو ایسا سدھا لیتے تھے کہ وہ سوائے ہمارے ناموں کے اور کچھ پہچانتے ہی نہ تھے۔ جس کی طرف اگر ہم نے اشارہ بھی کر دیا، جھٹ اس نے بڑھ کر ادارتی خلعت اور بڑائی کا لائسنس نذر کر دیا۔ ویسے ایسے جہازی قلم کے جناتی رسالے نکلوا دئیے کہ دیکھنے والے بھی چکر میں پڑ گئے کہ جب اتنا کچھ ہے تو آخر اس میں کچھ تو ہوگا۔ مجال تھی کہ ہماری شان کے خلاف کوئی منھ سے ایک لفظ بھی نکال سکے، باغی کو فوراً گھیر کر مار لیتے تھے۔ تم لوگ عجیب سرپھرے ہو نہ مصاحب کی پرواہ کرتے ہو نہ نفع اور شہرت کی۔

خیر ہم کو تو جو کچھ لکھنا تھا لکھ گئے اور امر ہو گئے۔ سنا ہے اب تم لوگ بھی لکھتے

ہو۔ مگر تم لوگ کیا کھا کر لکھو گے۔ نہیں نہیں تم لوگ لکھ ہی نہیں سکتے۔ نہ آخر لکھ ہی کیسے سکتے ہو۔ نہ تم لوگوں میں ادیبوں کی طرح اچھلنے کودنے اور اپنے کو منوانے کے گر آتے ہیں نہ وہ شطرنجی چالیں۔ اسی لیے لکھنا لکھانا تمھارے لیے بیکار ہے، تمھارے لیے جو کچھ لکھیں گے وہ ہم لکھیں گے جو کچھ کہیں گے وہ ہم کہیں گے۔ تم لوگ خود نہ کچھ لکھو اور نہ کچھ کہو۔

تم کو شکایت ہے کہ ہم ناموں کی فہرست گنوا دیتے ہیں مگر جو لوگ ہمارے بہی خواہ ہیں، صاحب! در خدمت گزار ان کے نام آخر ہم کیسے نہ لیں۔ ہم تو اپنی طبیعت کے بادشاہ ہیں۔ چاہیں تو نئے کے ساتھ پرانے اور پرانے کے ساتھ نئے نام گنوا دیں۔ آخر تم کو ہمارے گنتی گننے سے کیوں اتنی چڑ ہے۔

تم ہم کو چند گنے چنے اور کرتب لاتے ہو۔ لیکن ان چند سے بچ کر نہیں جا سکتے یہ چند ہی سب کچھ ہیں۔ یہ تمھاری سرباتوں کا اینٹ اور پتھر سے جواب دیں گے اگر تم نے کبھی منھ کھولا، اُف کیا، نخرے دکھائے تو ہم سب مل کر تمھارے اوپر حملہ کر دیں گے۔

ہم کو یہ جواب تم کو نہیں دینا چاہیے تھا۔ مگر دے رہے ہیں۔ تاکہ اب بھی تمھاری آنکھیں کھل جائیں اور تم ہم پر تنقید کا حربہ کرنے اور ہماری اقدار و قیمت کا تعین کرنے سے باز آجاؤ۔

دعاگو، دی آئی ہیز

"معمارِ اعظم"

پڑھے لکھوں کے خطوط محمد فاضل کے نام

چائنا پیک، نینی تال
یکم ستمبر ۶۱ء

از جناب پروفیسر دہمی شکار پوری
میٹرک ایف۔ اے۔ بی۔ اے ڈی۔ ڈی ٹی

محترمی محمد فاضل صاحب! آداب تسلیمات۔ سلام علیکم

آپ کے لیے "قہر الہیٰ" بھیج رہا ہوں سہ

گر قبول افتد زہے عز و شرف

واضح ہو کہ یہ ایک المیہ فیچر ہے جو میں نے آپ کے پرچہ کے لیے خون پسینہ ایک کر کے لکھا ہے۔ اس میں فانی دنیا کی فنا سے بڑھتی ہوئی بیزاری پر ایک مقبول عام تبصرہ و تنقید آپ ایک ساتھ پائیں گے۔ یہ دنیائے ادب میں ایک نیا تجربہ و اضافہ ہے جس کو شائع کر کے آپ نہ صرف ثواب دارین کے حقدار ہوں گے بلکہ آپ اپنے

رسالہ کے ذریعہ جو شعر و ادب کی بے تکان خدمت کر رہے ہیں اس کی رفتار کچھ اور بڑھ جائے گی۔

ایمان کی بات تو بھائی فاضل یہ ہے کہ اگر اس وقت کوئی شخص ادب کی خدمت کر رہا ہے تو وہ آپ اور صرف آپ ہیں۔ اس سلسلہ میں بحلف اٹھا سکتا ہوں کہ دوسرے لوگ یا تو گھاس کھود رہے ہیں اور یا آپ کے سامنے پانی بھرنے میں مصروف ہیں۔

فاضل بھائی سنجیدگی سے عرض ہے کہ اگر اتنا مکھن لگانے کے بعد بھی آپ نے "قہر الٰہی" کو ردی کی ٹوکری میں ڈال دیا تو مجھے اور میرے دوستوں کو بے حد افسوس ہوگا۔

باقی سب حالات لائق شکر ہیں۔ امید ہے کارڈ لفافہ سے یاد فرمائیے گا۔ رسید، دلئے اور خیریت کا انتظار ہے، بھابھی کو آداب اور بچوں کو پیار۔

آداب گزار۔ دہمی ترشکار پوری

کرسی ضلع بارہ بنکی
۱۲ر اگست ۱۹۶۱ء

از پیر و شیر کرمی یاسی
ایم اے پی ایچ ڈی۔ بی ٹی (بلیکڈ)

فاضل بھائی۔ آداب

آپ سے زبردستی رخصت ہو کر ابھی ابھی گھر واپس پہونچا ہوں۔ رخصت ہوتے وقت میرے مزید قیام کے لیے آپ کا اصرار مجھے ہمیشہ یاد رہے گا۔ کیونکہ کھینچا تانی میں میری اکلوتی شیروانی پیچھے سے اور بغلوں میں سے نکل گئی۔

آپ کے خط کے لیے پلاٹ میں نے آپ کے حسب ہدایت راستے ہی میں تیار کر لیا تھا۔

آپ نے دعوت میں جو مچھلی کھلائی تھی اس کی ڈکاریں مجھے ابھی تک آرہی ہیں۔ اور اگلے ماہ کی تنخواہ ملنے تک آتی رہیں گی کیونکہ اس ماہ کی تو پوری تنخواہ آپ کے گھر کی دعوت میں لگ گئی۔ میں وہ وقت نہیں بھول سکتا جب آپ نے اپنے سامنے سے دال کی پلیٹ اٹھا کر بڑے خلوص سے میرے آگے بڑھا دی تھی اور خود محض پلاؤ کی پوتے دو قابوں پر قناعت کر لی تھی۔ اللہ اللہ وہ بھی کیا دعوت شیراز تھی۔ دوران طعام میں نے جب ادب کے جدید رجحانات پر بحث چھیڑنا چاہی تو آپ کس شان سے آنکھیں بند کیے منہ کھولے نوالے بازی میں مصروف تھے۔ میری سادگی ملاحظہ فرمائیے جس کو میں آپ کے آنکھ بند کر کے کھانے کی ادا سمجھ کر دل ہی دل میں باغ باغ ہو رہا تھا وہ محض آپ کے پسندیدہ خراٹے تھے۔ کسی شاعر نے کیا خوب کہا ہے ؎

اور میں نے اس کے خراٹے سنے

ارے ہاں کہیں میں بھول نہ جاؤں، بطور تبرک صرف پانچ غزلیں بھیج رہا ہوں اگر ان میں سے ایک بھی پسند آگئی تو میں اسے اپنی قریب ترین کامیابی سمجھوں گا۔ شعر و ادب کی خدمتیں آپ اور آپ کا پرچہ جس رفتار سے کر رہے ہیں ان کو دیکھتے ہوئے دل چاہتا ہے لکھ دوں کہ آپ کا رسالہ ایشیا کا عظیم ترین رسالہ ہے جس میں اپنی غزلیں بڑی پابندی سے ہر مہینے کی پہلی تاریخ کو چھپی ہوئی پاتا ہوں۔ بھابھی کو بے پناہ پیار۔ ٹن ٹن اور بے بی کو دعائیں۔

آپ کا رفیق کار

کرمی پاسی کرسوی

قصور۔ مغربی پنجاب
۷ر اگست ۵۹ء

از جناب مرید جگوری
ادیب ماہر

بھائی محمد فاضل۔ خلوص

ماشاء اللہ۔ آپ کا رسالہ فوج کے رسالہ کی طرح بڑی مستعدی سے دائیں بائیں آگے پیچھے بڑھ رہا ہے۔

ماہ حال کے رسالہ کے ایک ورق کا کچھ حصہ ابھی ابھی میری نظر سے گزرا۔ میری بچی دوا آنے کی پسی ہوئی مرچیں بازار سے لائی تھی۔ اس ورق کو پڑیا باندھنے کے لیے استعمال کیا گیا تھا۔ اس ورق پر دونوں طرف جو اشتہارات دیئے ہوئے ہیں وہ مجھے بے حد پسند آئے۔ اردو ادب میں آج تک کوئی رسالہ ایسا نہیں پیدا ہو سکا جو اتنے دلچسپ اشتہارات دے سکے۔ اور خاص طور پر آپ کا وہ اشتہار جو دس غزل کے برابر دیا ہوا ہے جس کا ایک شعر یہ ہے۔

میری راتوں کی اڑ گئیں نیندیں
آپ دن میں بھی سوتے رہتے ہیں

اس دوا کے بنانے والے کا نام اور پتہ پھٹ گیا ہے براہ کرم آپ اس کا نام اور پتہ بہت جلد بھیجدیں۔ میری آنے والی نسلوں پر آپ کا احسان ہوگا۔

آپ کے رسالے کے آئندہ شمارے کے اداریئے کے لیے نوک جھونک لکھ کر بھیج رہا ہوں۔ اگلے دو ماہ تک میں مصروف رہوں گا اس لیے دو ماہ کی نوک جھونک کے لیے کسی اور سے لکھوانے کا انتظام کر لیجئے۔ مگر خیال رہے کہ انداز بیان میں فرق نہ آجائے میرا دعویٰ ہے کہ آپ جس دن بھی دنیا سے اٹھ گئے اردو ادب سے یہ نوک جھونک

بالکل ختم ہو جائے گی۔

بھابی کو پیار۔ بچوں کو آداب۔

نیازمند۔ مرید جگجوری

ٹیلرنگ آباد
۱۸ اگست ۱۹۵۹ء

از جناب کلن "ماشٹر"
ادیب ماہر

محترم!

امید ہے فراک اور جمپر بچوں کو پسند آئے ہوں گے۔ بھابھی کے کپڑے ابھی رفو نہیں ہو سکے۔

آپ نے گوگو اور بٹو کے بارے میں دریافت کیا تھا۔ گوگو نے پڑھنا لکھنا ترک کر کے پھر سے گیٹے کھیلنا شروع کر دیا اور بٹو کی ماں نے مار مار کر اس سے افسانے لکھنے چھڑوا دیئے ہیں۔ کیونکہ اس نے خطوط بغرض اشاعت لکھنے کے بہانے آپ کے علاوہ نہ جانے کس کس کے لیے اور بھی خطوط لکھنے شروع کر دیے تھے۔

حسب الحکم یکلخت چار افسانے بھیج رہا ہوں ان میں سے دو گوگو اور بٹو کے نام سے اور ایک ایک میرے اور آپ کے نام سے۔

بھابی اور بچوں کی خیر سلا کا طالب۔

آپ کا بھائی
کلن ماشٹر

خیرآباد
۲۳ ؍ اگست ۱۹۵۹ء

از جناب داماد خسرآبادی
بی اے۔ ایم اے

محترم فاضل بھائی

ایک "احمق" بھیج رہا ہوں امید ہے اسے دیکھ کر آپ خوش ہوں گے۔ آپ کی داستانِ غم پڑھی اور معاوضہ وصول کیا۔ حیرت ہے کہ آپ جیسا بجس آدمی بھی الجھنوں میں مبتلا ہو سکتا ہے۔ رسالہ کے ساتھ ساتھ دواؤں کا کاروبار بھی ہر قیمت پر جاری رکھئے ورنہ نامرادوں کو راہ کیسے ملے گی، بوڑھے جوان کیسے ہوں گے؟ نابینا بینا کیسے ہوں گے اور پھر جب یہ سب نہ ہوگا تو پڑھے لکھے گا کون؟ واقعی مہربان آپ سچ فرماتے ہیں، مختلف ناموں سے اتنے بہت سے دھندے کرنا اور مشکلات سے لڑنا کوئی آپ سے سیکھے۔

بھابھی اور بچوں کو آداب

آپ کا داماد

گویامئو
۲۴ ؍ اگست ۱۹۵۹ء

از جناب بنجمہ گویاموی
(مڈل دگولڈ میڈلسٹ)

بھائی فاضل۔ سلام

آپ کی فرمائش ملی۔ افسانہ لکھنا سخت مشکل تھا اور پیسہ ہونا اس سے بھی مشکل آپ کے خلوص کا مارا ہوا ہوں۔ تعجب ہے آپ نے میرے پچھلے اٹھارہ شاہکار افسانوں میں سے ایک کو بھی لائقِ اشاعت نہ سمجھا۔ اس کی شکایت نہیں کہ آپ نے وہ افسانے نہیں پڑھے۔ دراصل افسانوں کا پڑھا جانا ضروری نہیں تھا۔ مگر آپ آپ نے شاید میرے

لکھے ہوئے "خطوط بغرض اشاعت" غور سے نہیں پڑھے جن پہ بے حد محنت صرف کی گئی تھی۔ بہر بھائی فاضل اب تو میں آپ کی دعا سے سند یافتہ بھی ہوں کیا آپ نے "بنجر گویاموی مڈل۔ (گولڈ میڈلسٹ)" نہیں دیکھا وہ تو کافی نمایاں لکھا گیا تھا۔

ادب کی جو خدمت آپ کر رہے ہیں وہ یہاں تو کوئی نہیں کر سکتا، ہاں امریکہ میں ایک آدھ صاحب کر رہے ہیں۔

بھابھی کو آداب۔ بچوں کو پیار۔

خلوص کام
بنجر گویاموی

---

۱۲ فٹ پاتھ۔ مفلس مارکیٹ۔ روزہ آباد
۱۲ر اگست سنہ ۱۹۵۹ء

از جناب رمضانی خان
بی۔ اے

فاضل چچا، آداب

تازہ ترین نظم حاضر ہے۔ پچھلی نظم کی بے پناہ کامیابی پر مبارکباد کا شکریہ۔ مجھے پچھلی نظم بھیجنے کے بعد خیال آیا کہ اس کے دو مصرعے بحر سے خارج ہو گئے ہیں۔ مگر میں آپ کو اطلاع دینا بھول گیا۔ شائع ہونے پر تین اور مصرعے کاتب نے بے بحر کر دیئے مگر خیر۔ عوام اور آپ نے پسند کر لیا یہ اس کی صحت کی سند ہے۔

پرچہ مسلسل ملے جارہا ہے اور چلا آرہا ہے۔

بھابی کو دعائیں۔ چھنّی منّی کو پیار

آپ کا رمضانی

بشارت گنج بریلی - دماغی ہسپتال — از جناب دلدار ولغت آباد
۲۵ اگست ۱۹۵۹ء — الیف - اے

فاضل صاحب۔

"ایک چور ایک اُچکا" کی کامیابی کے بعد اب "دو رہزن دو ڈاکو" قبول فرمایئے معاف کیجیئے گا۔ "ایک چور ایک اُچکا" اس سے قبل میں نے اپنے اصلی نام سے بھیجا تھا۔ اس وقت اس کا عنوان "ایک اور چور ایک اور اُچکا" تھا جس کو آپ نے شائع کرنے سے معذوری ظاہر کی تھی کہ وہ آپ کے معیار پر پورا نہ اترتا تھا۔ بعد میں میں نے یہی افسانہ مس دلداری۔ اے کے نام سے بھیجا تو نہ صرف آپ نے شکریہ کے ساتھ شائع کیا بلکہ وہ پبلک میں بے حد مقبول ہوا۔

موجودہ افسانہ اپنے نام سے بھیجنے کی جرأت کر رہا ہوں۔ اگر آپ کے معیار پر پورا نہ اُترے تو واپس نہ کیجیئے گا بلکہ مس دلداری اے کے نام سے شائع کر دیجیئے گا۔ خاصا معیاری ثابت ہوگا۔

مزید لکھیئے کہ میں کب تک اپنے اصلی مردانے نام سے افسانے بھیجنا شروع کر دوں۔ اگر خط پسند نہ آئے تو فوراً تحریر کیجیئے گا۔ اس سے زیادہ تعریف کا خط فوراً آپ کو بھیج دوں گا۔ بھابی اور بچوں کی خیریت سے نوازیئے۔

آپ کا دلدار

منشی نگر — از جناب منشی نرائن
۲۹ اگست ۵۹ء — بی اے

محترمی فاضل صاحب۔ آداب

بڑی حیرت ہے کہ آپ کو خط پسند آ گیا۔ مگر افسانہ نہیں پسند آیا۔ اتنی جلدی ممکن نہیں کہ دوسرا افسانہ لکھ سکوں۔ مجھے آپ کی شرط منظور ہے۔ اس بار آپ خط چھاپ دیجئے۔ اگلی بار افسانہ۔

آئندہ افسانہ کے ساتھ خط بھیجوں یا تصویر؟ میری جانب سے پوری آزادی ہے آپ جو چاہیں خط میں اضافہ کر سکتے ہیں۔ اگلا افسانہ بھی کسی لڑکی کے نام سے ہو یا اپنے نام سے ہی بھیجوں۔ یوں مجھے کوئی خاص جلدی نہیں۔

بھائی کو آداب

آپ کا منشی

آئینے

اُردو میں خاکہ نگاروں کی کمی نہیں اتنا کچھ لکھ جانے کے بعد اب
اس صنف میں کچھ لکھنا بڑی ہمت اور دلیری کا کام ہے ـــــــــ
مگر مزاح نگار احمد جمال پاشا مدیر اودھ پنچ نے ایک بالکل ہی نئے
انداز سے ہند و پاک کی اُن ممتاز ادبی ہستیوں کو ہم سے ملایا ہے
جنھیں انھوں نے قریب سے دیکھا اور پرکھا ہے۔ پھر اپنے مخصوص
اور تیکھے شگفتہ انداز میں پوری ادبی دیانت و پورے خلوص
کے ساتھ ان کی خوبیوں اور خامیوں کو پیش کر دیا

عبدالماجد دریا بادی، رشید احمد صدیقی، علی عباس حسینی،
آل احمد سرور، احتشام حسین، حیات اللہ انصاری، اختر
انصاری، خورشید الاسلام، اسلوب احمد انصاری، فراق
گورکھپوری، شوکت تھانوی، کنھیا لال کپور، خلیل الرحمٰن
اعظمی، جذبی، ذوقی اور دوسرے۔

ــــــــــ (زیر طبع)

چند حسینوں کے خطوط

خطوط کی شکل میں بڑی دلکش وحسین پیروڈیاں، مثلاً کُتے کا خط پطرس کے نام۔ گدھے کا خط کرشن چندر کے نام۔ اور نہ جانے کس کس کے خطوط کس کس کے نام ہیں۔ طنز و مزاح سے بھرپور تنقید یں ادب و زندگی کے بہت سے پہلوؤں کی نقاب کشائی کرتی ہیں ——
احمد جمال پاشا نے ان مضامین کو اپنے مخصوص دلنشین انداز میں پیش کیا ہے۔

فن لطیفہ گوئی (تاریخ، تنقید و انتخاب!)

لطیفہ پر اردو ادب میں ایک سنجیدہ مضمون بھی نہیں ملتا۔ لطیفے کا تعلق فنون لطیفہ ہی سے نہیں بلکہ طنز و مزاح سے بھی بہت ہی گہرا تعلق ہے۔ سنجیدہ پڑھے لکھے طبقے میں ادھر اس کمی کا احساس شدت سے ہو چلا ہے۔

احمد جمال پاشا نے اس کمی کو پورا کرنے کے لیے بہت ہی محنت کے ساتھ لطیفے کی تاریخ مرتب کی، عربی فارسی اور اردو کے اچھے لطائف کا انتخاب بڑی محنت سے کیا اور اس کے تاریخی ارتقا پر ایک تحقیقی مقالہ تصنیف کیا۔ موصوف کا یہ کارنامہ ان کی برسوں کی تلاش و تحقیق کا خلاصہ ہے۔ اردو ادب میں اپنے موضوع پر یہ پہلی کتاب ہی نہیں بلکہ لطیفہ کی پہلی تاریخ

پنچ پبلشرز۔ بارہ دری منزل، کچا احاطہ امین آباد لکھنؤ